



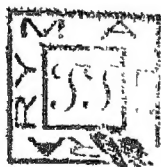
# گنج ہائے گرانمایہ

از

رشید احمد صدیقی

صدر

شعبہ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ



اُردو پاک بھنبی علی گڑھ

قیمت ۸۰

جلد ۱

۱۳۶۱ هـ مطابق ۱۹۴۲ ع  
مطبوعه  
ریاض هند پریم علی گڑھ

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم  
تو نے وہ گنج ہائے گرامنسا یہ کیا کئے

(غالب)

M.A. LIBRARY, A.M.U.



U12157

$0a R_v$   
 $whw R = 1, 2, 3$   
 $R = R_{even}$   
 $R = R_{odd}$

# فہرست (0a R<sub>v</sub>)

whw R = 1, 2, 3

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
ج-ب	عرض ناشر	۱
۵-۱	محمد علی	۲
۱۶-۴	ڈاکٹر انصاری	۳
۴۰-۱۷	میرے مولانا (مولانا سید سلیمان اشرف صاحب مجرم)	۴
۱۱۸-۷۱	مولانا ابوبکر (مولانا ابوبکر محمد شہید فاروقی مجرم)	۵
۱۴۹-۱۱۹	اصغر گوندوی	۶
۱۷۲-۱۵۱	ایوب (محمد ایوب عباسی مجرم)	۷
۱۹۶-۱۷۳	اقبال	۸
۲۱۹-۱۹۷	احسن مارہروی (مجرم)	۹



## عرضِ ناشر

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی (علیگ) کے ان مضامین کو پیش کرتے وقت میں خوشی بھی محسوس کرتا ہوں اور ندامت بھی۔ خوشی یوں کہ ان کی تحریر کا یہ انداز جواب تک عام نظروں سے اوجھل رہا ہے اس طرح ہم سب کے سامنے آجائے گا اور ندامت اس لیے کہ ان مضامین کے حاصل کرنے اور بغیر کسی پس و پیش کے شائع کر دینے میں ایک مخلصانہ سازش کو بھی دخل ہے جس کا علم پروفیسر صاحب کو اس وقت تک نہ ہوا جب تک کہ سارے مضامین شائع شدہ شکل میں اُن کے سامنے پیش نہیں کر دیے گئے۔

اس غلطی پر میں اور پروفیسر صاحب کے صاحبزادے احسان رشید صدیقی صاحب بہت کچھ موردِ عقاب بھی ہوئے لیکن جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ البتہ مجھے اس کا اطمینان ضرور ہے کہ میری اس ”نا سمجھی“ پر ناظرینِ کرام مجھ سے اتنے آزر دہ نہ ہوں گے جتنا کہ پروفیسر صاحب ہوئے۔



یہ مضامین باسٹشیا اور آخری نمبر اخبارات و رسائل میں  
 وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے ان کو آنکھ بند کر کے شائع کر دیا۔  
 چنانچہ کتابت کی وہ ساری غلطیاں یا ناہمواریاں جو مضامین کے  
 چھپنے میں راہ پا جاتی ہیں اگر اضافہ کے ساتھ نہیں تو جوں کی توں اس  
 مجموعہ میں کبھی داخل ہو گئی ہیں۔ یہ مضامین متعلقہ دوستوں و بزرگوں کی  
 وفات پر فی الفور لکھے گئے اور شائع ہو گئے۔ اگر ان پر نظر ثانی کر لی جاتی  
 تو نہ صرف وہ خامیاں دور ہو جاتیں جن کا وقت اور موقع کے لحاظ سے  
 راہ پا جانا لازمی تھا بلکہ یہ کئی اعتبار سے اور بہتر ہو جاتے۔ اس فردگزشتہ  
 کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ہے۔

اپنی اس نا سمجھی پر میں پروفیسر صاحب اور ناظرین کرام دونوں  
 سے معافی کا خواستگار ہوں اور احسان رشید صدیقی صاحب کا شکریہ ادا  
 جن کی اعانت بغیر یہ سازش پایہ تکمیل کو پہنچ سکتی!

خاکستہ

افتتاح الرحمن آرزو

{ ۸ اپریل ۱۹۶۹ء }

## محمد علی

ولادت تو مادر زاد ہوتی ہے لیکن محمد علی کی موت خاندانِ زاد تھی۔ عام طور پر موت اپنا انتخاب خود کرتی ہے لیکن محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا! اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں کو ایک حقیقت بنا دیا۔ سنگین اور صلح!

محمد علی کی زندگی اور موت دونوں ان کی انفرادی اور شخصی افتاد طبع کی ایک جلوہ گری تھی اور شخصیت کی اسی جلوہ گری کا نام آرٹ ہے۔ صحیح اور گراںمایہ!

---

محمد علی کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز تھے۔ کس کی زندگی میں نہیں ہوتے لیکن ان کی موت نے ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو پُر شوکت بنا دیا۔ محمد علی کو بد توفیقوں اور بد مذاقوں سے سابقہ پڑا ایسے بد توفیق اور بد مذاق جو بھوکے تھے بواہوس اور اکثر کینہ پرور بھی۔ محمد علی نے ان سب سے انتقام بھی لیا، لیکن اپنی زندگی میں نہیں بلکہ اپنی موت سے!

---

۱  
 محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن ان کا کوئی گناہ  
 نہیں ہے۔ یہ سنگدلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے۔ مرد غازی کے کارنامہ کا  
 اندازہ مقبوضات کی وسعت، مال غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی سہمی  
 طرب انگیزی، تمنغہ اور سلجہ کی چمک اور چھنکار سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا اندازہ  
 کیا جاتا ہے تو ٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زہرہ بتے ہوئے لہو، دہتی ہوئی رُوح  
 اور دکتے ہوئے چہرہ — ڈوبتے ہوئے سورج سے !

---

محمد علی کا قلب حزیں تھا لیکن روح امر بتی — بشارت ازلی تھی۔  
 حزیں یوں کہ جن کو وہ محبوب رکھتے تھے وہ بھی ان کے مخالف تھے کیسی  
 مخالفت اصولی نہیں بلکہ اکثر ذاتی مفاد، نفس پروری اور تن آسانی کے  
 تحفظ کے لئے وہ ایک شیر کی مانند تھے جس کو شیروں سے نہیں بلکہ لومڑی اور  
 بھڑیوں سے سابقہ ہو۔ بشارت ازلی اس لئے کہ شخصیت کامیاب رہی۔  
 شخص کا انجام ناقابل التفات۔ افراد کی ناکامی حق کی کامیابی کی دلیل  
 ہے۔ — روشن اور محکم !

---

محمد علی کی ذہانت اور فطانت اب کہاں ملے گی۔ وہ یتیم صیل تھی جو رزم  
 میر، بے پناہ تھی اور رزم میں ابک جلوہ گری۔

وہ مخالفت اور مقابلہ میں بے باک اور بے پناہ تھے۔ اپنے چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے ان کو پناہ دیتے تھے۔ ان کی دلہی اور دل آسانی کرتے۔ ان کے لئے مارنے مرنے پر تیار رہتے۔ محمد علی کی آغوش میں رحمت تھی۔ ان سے مدد لینے کے معنی یہ تھے کہ اب ساری ذمہ داری ساری فحاکت و ہلاکت محمد علی کی اور کامیابی یا شہرت مدد لینے والے کی!

وہ آغوش مادرِ بازوئے برادر اور راحتِ غزیاں تھے!

کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے بولتے تو معلوم ہوتا کہ بوالہول کی آواز اہرامِ مصری سے ٹکرا رہی ہے، لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کرب کے کارخانے میں نہیں ڈھلتے والی ہیں یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہو، میں نے ان کو اسٹیج پر لے کر اور بولتے ہوئے سنا ہی اور خود محمد علی کو داد دینے سے پہلے انیس کو داد دی ہے۔

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھارے!

محمد علی پر روپے اور شہرت کی بارش ہوئی اور محمد علی نے ان دونوں کو سیلاب بنا کر بہا دیا۔ دونوں نے مفارقت کی۔ بدنامی اور مفلسی سے بھی سابقہ پڑا لیکن یہ چیزیں جسم و جان کی تھیں۔ ان کی روح پاک تھی۔ طاہر کیا معلوم

زندہ رہتے تو کیا ہوتا۔ یورپائے یوڈیز اور سرسبز سلیمان کو کیساں سمجھنے والے کی  
موت آخر کیا شہادت دیتی ہی!

محمد علی کی موت کا حال جب میں نے سنا تو تھوڑی دیر کے لئے یقین نہیں  
آیا اور رہ رہ کر یہ خیال اتار ہا کہ محمد علی کو آخر موت نے زیر کس طور پر کیا —  
خود موت پر کیا گزری ہوگی!

پھر سوچنے لگا کہ اگر محمد علی کی بجائے قضا و قدر یہ چارہ کار پیش کرتے کہ اچھا  
محمد علی کی بجائے ہندوستان کے کسی مسلمان لیڈر کو حوالہ کرو۔ یہ سوال آتے  
ہی خدا جانے فیصلہ دل میں کیسے آیا اور انتہائی قطعیت کے ساتھ کہ محمد علی  
کے بدلہ میں ہندوستان کا بڑے سے بڑا لیڈر دیا جاسکتا تھا اور اس کا ماتم  
نہیں قائم ہوتا!۔

لوگ آزدہ نہ ہوں، انسان کے دل میں عجیب عجیب خیالات آتے رہتے  
ہیں۔ انہیں خیالات کو کبھی الامام قرار دیا جاتا ہے اور کبھی یہ صرف مہمل بھی ہوتے  
ہیں لیکن خیال کے عجیب تر ہونے کی معنی ہمیشہ مہمل یا مہمل تر ہونے کے نہیں ہیں۔  
محمد علی میں کمزوریاں بھی تھیں لیکن کمزوریاں نہ ہوتیں تو آج کل کے مسلمان  
لیڈر مصطفیٰ کمال، اور برطانوی شہنشاہیت پر کیا گزر جاتی!

ملک و ملت کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ لیکن نعرہ جنگ خاموش ہے۔ فتح و  
 شکست تو اسی لئے بنائے گئے ہیں کہ فتح و شکست ہوتی رہے لیکن جنگ کہاں  
 و شہادت کس کو نصیب ہوگی، ایسا حین کہاں جس کی خود نرید کو تلاش ہو!

---

اے جہاں کل فاتح بیت المقدس نے سر جھکایا تھا۔ وہاں آج محمد علی کی  
 عراج منائیں!!

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر واللہ اکبر

---



## ڈاکٹر انصاری مرحوم

سہر خاک شہیدے برگمائے لالہ می پاشتم

ڈاکٹر انصاری موجود تھے اور کسی کے مرنے کی خبر سننے میں آتی تھی تو سوال فوراً زبان پر آتا تھا ڈاکٹر انصاری کو بھی دکھایا تھا؟ اب جبکہ ڈاکٹر انصاری کی رحلت کی خبر آئی تو تھوڑی دیر تک عقل و حواس معطل رہے، سوچنے لگا آخر ڈاکٹر انصاری کیوں کر جاں بحق ہوئے اور یہ کیوں کر ممکن ہوا کہ وہ خود اپنے لئے اس موت کا سد باب نہ کر سکے جس کو ان کی تھری پمپیلی گہری اور مرض اور تندرست دونوں کو تسکین دینے والی آنکھیں ہمیشہ روک دیتی تھیں مال دیتی تھیں اور جگا دیتی تھیں۔

میں ہمیشہ مریض رہا اور ڈاکٹر انصاری سے اپنی تکلیف رجوع کرتا رہا میں جانتا تھا کہ میرا مرض معمولی مرض نہیں ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں ہے یہی حالت میں جب ذہن کی فضا ایسی ٹھیلی، نمناک اور غلیظ ہو جاتی جس کو میں اس طرح چھو سکتا تھا جیسے گلی سٹری پیمپوندی کو اس وقت میں اُن کے مطب کا رخ کرتا۔ انتظار میں اکثر زیادہ وقت صرف ہوتا اور میں اُن کے انتظار کے کمرہ میں بیٹھا، فچھوری کی دوکانوں، گزرنے والوں کی ٹانگ، دو گاڑیوں اور پھیری والوں کے شور و شغب دیکھتا اور سوچتا کہ یہ چیل پیل، یہ لہر، یہ شغولیت، یہ خلفشار زندگی



جو جس سے میں ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا جاؤں گا، زندگی ہی وہ کل ہی جو اپنے  
جزو سے مستغنی ہو تو مجھ پر ہر اس، مایوسی اور اکثر بغاوت کا جذبہ طاری ہو جاتا۔  
اور میں زیادہ بیانی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا منتظر ہو جاتا۔

اتنے میں ڈاکٹر صاحب کی آمد کی خبر آتی، وہ اپنے مضبوط اور بہوار قدموں  
سے زمین پر چڑھتے اور کسی چراہی سے گفتگو کرتے ہوئے سُنائی دیتے دیکھتے  
ہی مسکرانے اور اس طور پر کہ گھنی ہلکوں کے نیچے سے اُن کی آنکھیں بھی مسکرانے  
لگتیں، کہتے بھی تم کہاں، بڑے عرصہ تک غائب ہے، میں کہتا ڈاکٹر صاحب  
بڑی تکلیف ہو، پریشان ہوں کچھ کرتے دہرتے نہیں بنتا۔ بولتے گھبراؤ نہیں  
ابھی دیکھتا ہوں، پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ باتیں اس لبِ لہجہ سے  
اور اس طرح ہنس ہنس کر اعتماد اور اعتقاد دل آسانی اور دلربائی کے  
ساتھ، دوستی اور بزرگی کی شان سے کہتے کہ مجھے خود محسوس ہونے لگتا کہ  
میں ناحق پریشان ہوا، اس سے پہلے کیوں نہیں آیا۔ خواہ مخواہ اتنے دنوں  
معیشت و مایوسی میں کیوں مبتلا رہا۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا اس سے بات کرتی جاتے  
اندار گفتگو سے محسوس ہوتا کہ وہ دوسرے سے بات اس لئے کر رہے ہیں کہ  
مجھے تقویت پہنچے اور مجھ سے گفتگو کرتے تو اوروں کو محسوس ہوتا کہ وہ دوسرے  
میں بھی اعتماد و اراکید کی روح بیدار کر رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ صرف مریض

یا اُن کے اعزاء نہ ہوتے بلکہ مختلف اقسام کے لوگ ہوتے۔ مقاصد کی نوعیت بھی جدا گانہ ہوتی، لیکن ڈاکٹر انصاری کی بات میں وہ جادو تھا کہ ہر شخص یہی سمجھتا کہ گوڈاکٹر انصاری مخاطب دوسروں سے ہیں لیکن کہ وہی رہے ہیں جو ہماری تقویت یا دلچسپی کا موجب ہو۔

ڈاکٹر انصاری اپنے معائنہ کے کمرہ میں لے جاتے، مجھے اس قسم کے معائنہ خانوں اور ایریشن روم وغیرہ میں جاتے کا اکثر اتفاق ہوا، لیکن جس امید و اعتماد کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر بھٹی (دکھنوی) کے حوالہ کیا ہے وہ مجھے کہیں اور نصیب نہ ہوا۔ ڈاکٹر انصاری اس طرح دیکھتے، ٹیٹے لگوا دیا وہ خود اپنے زخم یا درد کو ٹوٹل رہے ہیں۔ اُن کی انگلیاں، خوبصورت، سڈول، گداز پاکیزہ، خوش رنگ اور ایسی معتدل حرارت کی ہوتیں اور اُن کو وہ اُس نرمی اور نزاکت کے ساتھ کام میں لاتے کہ مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کسی دوسرے کی انگلیاں میرے جسم کو چھو رہی ہیں۔ آہ ان کی گہنی ایروٹیں اور لمبی پلکوں والی گہری روشن اونٹنی ہوتی آتھیں اور شیر و شمد سی نگاہیں جو ہم و جان ہیں اس طور پر نفوذ کرتیں جیسے کوئی اچھا خیال یا اچھا کام قلب کو بالیدہ جذبات کو رنگین اور خیالات کو بلند کر دیتا ہو۔ وہ مریض کا معائنہ ایسے کرتے جیسے وہ اُن کا جان چھڑکنے والا بھائی پھیتا بیٹا یا جان نثار دوست ہے۔ اُن کی پشانی ایک روشن فصاحتی جس میں مریض

کو ایسا اور برائے والی امید کے نقوش نظر آتے تھے۔  
 معائنہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا کہ ڈاکٹر انصاری کو آج تمام دن کچی  
 اور کام کرنا نہیں ہے اور اسی مریض پر تمام وقت اور توجہ صرف کر دیں گے۔  
 معائنہ ختم کرنے کے بعد میز پر لیٹے ہوئے مریض کو خود سہارا دے کر اٹھاتے۔ کچھ  
 دیر تک اسے میز پر پاؤں اٹکائے ہوئے بیٹھا رہتے دیتے اور خود اس کے  
 پاس کھڑے ہو کر اس طور پر باتیں کرتے جیسے اپنے کسی گھر کے بے تحلف دست  
 سے خوش گئی کر رہے ہوں۔ اس کے بعد سہارا دے کر میز سے اُتارتے،  
 کپڑے پہنانے میں مدد دیتے، نسخہ لکھتے، استعمال کی ترکیب بتاتے اور رخصت  
 کر دیتے۔

ڈاکٹر انصاری سے رخصت ہو کر میں اپنے آپ کو بالکل تندرست سمجھنے لگتا۔  
 اگر مرض کی کچھ تکلیف بھی ہوتی تو سمجھتا کہ دوا استعمال کرنے کے بعد ہی جاتی  
 رہیگی۔ چنانچہ میں مطب سے اترتے ہی فقیہ پوری اور چاندنی چوک کی چل پل اور  
 ہبھی میں گم ہو جاتا۔ چل والوں کے ہاں سے چل خریدتا اور کسی ہول میں جا کر  
 کھانا کھاتا اور مدتوں پرہیز کرتے کرتے کھانے پینے کا جو لطف کھو چکا ہوتا اس کو  
 بد پرہیزی سے از سر نو حاصل کرتا۔ دل کا اندوہ چھٹ جاتا اور زندگی خوشگوار  
 اور خوش آئند معلوم ہونے لگتی۔

میں نے ایک بار ڈاکٹر انصاری کو سر جری کرتے بھی دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا

تھا جیسے کسی ماہر مصور کے ہاتھ میں قلم ہے یا کوئی مرصع ساز کسی نازک زیور یا مشین پر کام کر رہا ہے۔ نشر ان کی انگلیوں میں اس طور پر کام کرتا جیسے بنیاد اپنے قلم سے خطوط کھینچ رہا ہے۔ نزاکت اور صلابت دونوں کا امتزاج ایسا امتزاج جو قوس قزح کے رنگوں میں پایا جاتا ہے، چہرہ پر سنجیدگی، آنکھوں میں لہرائی، انگلیوں میں صفائی اور تیزی۔ آپریشن میں آلودگی کا ہونا لازمی ہے لیکن ڈاکٹر انصاری کو آپریشن کرتے دیکھتے تو معلوم ہوتا جیسے مشین کا ماہر مختلف ٹکڑوں کو جو اسکرپٹ سے جڑے ہوں، خوبی پھرتی صفائی اور اعتماد کے ساتھ علیحدہ کر رہا ہے۔

میں گزریں میری طفولیت اور الملل کے شباب کا زمانہ تھا۔ الملل کے جتنے پرچے آتے تھے ہم لوگ اس کو شوق اور عقیدت سے پڑھتے تھے۔ عبارت سمجھتے تو فخر کرتے اور جہاں نہیں سمجھتے تھے وہاں یہ خیال کرتے تھے کہ کوئی بڑی بلند یا گہری بات کہی ہو جو ہماری سمجھ سے باہر ہے اس لئے اس کا احترام اور زیادہ کرتے تھے۔ پچھلی بار گھر گیا۔ بچپن کی الماری گرد و غبار سے اٹی بڑی ہوئی تھی۔ ایک پر اتفاقہ نظر چا پڑی۔ دیکھا تو اس قدر کی تصویر تھی جو ڈاکٹر انصاری مرحوم کی سرکردگی میں یہاں سے جنگ بلقان میں زخموں کی مرہم پٹی کے لئے لیا تھا۔ یہ تصویر اس زمانہ میں الملل میں شائع ہوئی تھی نیچے لکھا ہوا تھا۔

”اے وہ لوگو کہ زخمیوں کے ملک میں جا رہے ہو جب ہاں  
پہنچنا تو خدا را اُن کے زخموں پر سختی نہ کرنا کیوں کہ وہ زخم  
ان کے نہیں ہیں بلکہ اسلام کے ہیں“

آہ وہ زمانہ یاد آ گیا جب ابوالکلام، محمد علی، ڈاکٹر انصاری کو ہم سب جانتے  
کیا سمجھتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ اسلام پر تیرہ سو برس نہیں گزریں  
ہیں۔ بڑے ہو کر ہم بھی ہندوستان سے باہر جا کر مسلمان مجاہد کی طرح لڑیں گے  
زخمی ہوں گے شہادت پائیں گے فاتح کہلائیں گے۔ دنیا دیکھے گی کہ اسلام اور  
اسلامیوں سے بڑھ کر کوئی نعمت اور نسلت نہیں ہے۔ آج جبکہ یہ سطور لکھ رہا  
ہوں ماضی کا بخار زندگی کی شاہراہ سے ہٹ گیا ہوا اور تصور کی کرنیں طفولیت  
کے اس افق پر پڑ رہی ہیں جہاں ہم رہ رہ کر تملنا اُٹھتے تھے کہ کیوں بچپن کا زمانہ  
نہیں ختم ہوتا اور ہم ترکوں کی مدد کے لئے۔ اسلام کا نام روشن کرنے کے  
لئے زخمی ہونے کے لئے شہداء کی صف میں کھڑے ہونے کے لڑکیوں  
نہیں بلاتے جاتے۔ لیکن اب کیا حال ہے ہم بدل گئے زمانہ بدل گیا دنیا بدل  
گئی رنج و راحت، غرت و ذلت کا تصور بدل گیا۔ زندگی کی جدوجہد وہی، تو  
لیکن جدوجہد کا لطف باقی نہیں رہا تصورات میں نہ رنگینی باقی رہی نہ حرارت  
غرائم میں نہ استواری ہو اور نہ برکت امانا موجودہ عہد کے مسائل اور مطالبات  
کچھ اور ہی ہیں فرائض اور ذمہ داریاں بھی بدلی ہوئی ہیں لیکن خدا کوئی یہ

بتائے یہ کیسے مسائل ہیں یہ کیسے فرائض ہیں جن سے دماغ میں روشنی نہیں پیدا ہوتی دلوں میں ولولے نہیں پیدا ہوتے ہاتھوں میں قوت نہیں پیدا ہوتی اور زندگی سے حرارت مفقود ہو چکی ہے۔

ظاہر ہے میں پرانے وقتوں کا ہوں راگنی بے وقت کی ہو، زمانہ ترقی کر چکا ہے، زندگی اور زندگی کے تار و پود نئے اسلوب سے مرتب ہو رہے ہیں ہر چیز کی قدر و قیمت گھٹ بڑھ رہی ہے۔ جس چیز کو ہم متاعِ یوسفی سمجھتے تھے وہ متاع کا سد سے زیادہ وقت نہیں رکھتی اور جسے اب دیکھ کر ہم محل اور سرسیمہ ہوتے ہیں وہی حاصلِ حیات سے۔ زمانہ اور زندگی کی رفتار ہی نہیں اس کا رخ بھی بدل گیا ہے، لیکن زندگی کی برہنگی کو حقائق کا انکشاف کیوں کہئے۔ سائنس کے کرشموں کو انسانیت کا معجزہ کیوں بتایا جاتا ہے۔ آرٹ اور ازادی کی قربان گاہ پر کن چیزوں کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے افراد کی شادی وغنی کیا ہوگی ان کی پروا کیوں نہیں کی جاتی۔ جماعت کے ریگ زار سے افراد کی امید اور امنگ کے ٹکستان کیوں فنا کئے جا رہے ہیں۔ یہ سب بے وقت کی راگنی صحیح رنج و راحت کا تصور اور وہ بھی درست لیکن رنج و راحت کا احساس کیوں کر بدل گیا؟

---

ڈاکٹر انصاری ہندو مسلمانوں کے نفاق و افتراق کو دور کرنے کی فکر میں

تمام عمر کوشاں ہے۔ وہ نفاق و افتراق کو ہندؤں اور مسلمانوں کا مرض سمجھتے تھے اور ایک سچے طبیب اور ڈاکٹر کی مانند مریض سے ہمدردی کرنے اور مرض کے ازالہ میں پوری توجہ اور دلسوزی اور قابلیت صرف کرتے رہتے انہوں نے ہندو مسلم اختلاف کو ہندو مسلم کی حیثیت سے نہ بھی پرکھا اور نہ اس کی چارہ سازی کی انہوں نے اس مرض کے ازالہ کی ایک حقیقی طبیب کی حیثیت کو شناس کی۔ ڈاکٹر انصاری کے لئے اس کے علاوہ اور چارہ کار ہی نہ تھا۔ وہ جب کرتے جیسا کچھ کرتے اور جتنا کر سکتے سب ڈاکٹر کی حیثیت سے کرتے اور ایسا ہی انہوں نے کیا۔

ڈاکٹر انصاری کی وفات سے کتنے لڑکے لڑکیاں یتیم ہو گئیں۔ بیوائیں وارث ہو گئیں۔ نوجوان بے دست و پا ہو گئے۔ رفقہا جی چھوڑ بیٹھے۔ وہ معلوم نہیں کن کن مواقع پر کیسے کیسے لوگوں کی مدد کر چکے تھے اس بڑے پسنے کی گردش سے کتنی چھوٹی چھوٹی اور مختلف متفرق مشینیں گردش کر رہی تھیں۔ وہ محتاجوں ہی کے مددگار نہ تھے بلکہ اُن لوگوں کی آں بان اور وضع داری کے بھی کفیل تھے جن کو ”اسیائے گردش ایام“ برابر پستی جاتی تھی۔ ایسوں کی دستگیری معمولی کام نہ تھا۔ دولت، اثر، اقتدار کا کتنا بڑا حصہ ان پر صرف ہوتا ہو گا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے ہر قسم کی مدد، انتہائے کسادہ جینی اور دیادلی کے ساتھ

دوسروں کی کی ہوگی۔ اور شاید کوئی ایسا نہ ہو جس سے اسی نوعیت کی مدد ڈاکٹر انصاری نے حاصل کی ہو۔

انہوں نے خوب کمایا خوب صرف کیا، ان پر ایسے ایسے مواقع بھی آئے جب ان کے پاس کھانے اور خرچ کرنے کو کچھ نہ تھا۔ لیکن ان کی زندگی میں کسی ایسے کو جس کے کفیل ڈاکٹر انصاری تھے کبھی کسی ایسے موقع سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ جب اس کو کھانے اور خرچ کرنے کی سختی جھیلنی پڑی ہو ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ تھی۔ ڈاکٹر انصاری کے رفقا میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جس نے ڈاکٹر انصاری کی اتنی مدد کی ہو جتنی ڈاکٹر انصاری نے اس کی کی۔ اب دیکھنا یہ ہو کہ وہ لوگ جن پر ڈاکٹر کے احسانات تھے ڈاکٹر کے لئے کیا کرتے ہیں۔ اور صرف اسی سے ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان اکثر و بیشتر صرف یہ کرتے ہیں کہ مدد لینے میں تو حق و ناحق کی بھی تمیز اٹھا دیتے ہیں لیکن مدد دینے کے وقت اور اس حالت کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں جب خود ہم کو مدد مانگنے کی ضرورت ہوئی تھی اور ہماری مدد کی گئی تھی۔

---

ڈاکٹر انصاری جامعہ ملیہ کے قیام و ترقی میں جو کچھ کرتے رہے اور ان کی بڑھتی اور بڑھتی ہوئی اس سے وابستہ تھے اس کا اندازہ میں کر سکتا ہوں۔ غالباً چند ہی



لوگ ایسے ہوں گے جو مجھ سے زیادہ اس کا احساس کر سکتے ہوں۔ ابھی ابھی رمضان کی ایک شام کو ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ جامعہ کی نئی عمارت دیکھنے ”اٹھلے“ گیا ہوا تھا۔ اٹھلے کے صاف سائے ورق پر ایک نقش اُبھر رہا تھا بدیع اور بلند عمارت کا نقشہ اور اس کا پیکر بھی ناممکن تھا۔ تصویر میں منتقل ہو رہا تھا۔ مستقبل کا افق دھیرے دھیرے ان تمام گہائیوں اور پستیوں کے ساتھ بے نقاب ہو رہا تھا جن میں مومن کا غم پرورش پاتا ہوا بالیدہ ہوتا ہے اور آفاق پر چھا جاتا ہے۔

عمارت کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک طرف ڈاکٹر انصاری آسودہ خاک تھے اور مدفن کے بہشتی بھروسے سے اپنے جنات کی فردوس تعمیر ہوتے دیکھ رہے تھے۔

دیر ہو رہی تھی ہم سب واپس آگئے

# میرے مولنا

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی  
 دوانا مر گیا آخر کو دیر لے پہ کیا گزری !  
 مولانا سلیمان اشرف صاحب اس بہان سے اُٹھ گئے اور اپنے  
 ساتھ وہ تمام باتیں لے گئے جو میرے لئے اب کسی اور میں نہیں میرا اُن  
 کا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ صرف علی گڑھ کا رشتہ تھا لیکن کس سے کموں اور  
 کون سمجھے گا کہ اس رشتہ میں کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ وہ میرے لئے عزیزوں  
 سے زیادہ عزیز تھے۔ بزرگوں سے زیادہ بزرگ اور دوستوں سے زیادہ  
 دوست۔

پریشان ہوتا تو ان کے ہاں جاتا۔ جی گھبراتا تو وہاں جاتا۔ خوش  
 ہوتا تو وہاں ضرور جاتا۔ اور جب کہیں نہ جانا ہوتا تو وہاں جاتا۔  
 گھنٹوں بیٹھا۔ کوئی معمولی جان پہنچان یا تعلقات کا آدمی پہلے سے ہو جو  
 ہوتا تو اسے رخصت کر دیتے۔ کوئی اچھا ملنے جلنے والا موجود ہوتا تو اسے  
 اٹھتے نہ دیتے۔ جو کچھ ہوتا اس سے ضرور تواضع کرتے۔ ایسا بھی نہ ہوا کہ  
 کوئی چیز موجود نہ ہو۔ مجھے چائے کا شوق نہیں مرحوم اس کے بڑے شائق

تھے اور بڑے تکلف سے پیتے۔ اصرار سے ایک پیالی دیتے۔ کہتے پی لو۔  
پھر گپ ہو گئی۔ ایک پان کھاؤ۔ دوسرا چھ بنا کر دو۔

میں کہتا آپ کے ہاں چائے میں نہ شکر نہ دودھ نہ فرد کیسی ہو گئی  
کہتے میرے لئے پیتے ہو یا اپنے لئے میں نے دبی زبان سے کہا بیوی  
بچوں کا بھی تو خیال ہے۔ فرمایا کبھی کبھی بیوی بچوں سے الگ رہ کر بھی زندہ  
رہ لیا کرو۔ میں کہتا آپ رام پوری تمباکو کھاتے ہیں۔ یہ میرے بس کی نہیں  
ہی۔ کہتے چائے میں دودھ شکر اور پان میں خوشبودار تمباکو کھاتے ہو نہ شبہ  
کا احترام کرنا نہیں آیا۔ آواز دیتے جٹا ارشید کی پیالی میں شکر ڈالنا پھر چاکر  
”جچھن“ رشید کو تمباکو دو۔ بڑی فریاد معطر تمباکو ہوتی۔

پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے۔ آج تک یہ نہ پوچھا کیسے ہو بال بچے  
کیسے ہیں۔ کیا کرتے ہو، ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوتی تو  
میں خود ہی کہتا یا انہیں پہلے سے معلوم ہوتی۔ کبھی انہوں نے مجھے گھر سے  
بلوانہ بھیجا کیسی ہی ضروری بات کیوں نہ ہوتی اس کے منتظر رہتے کہ چلتے  
پھرتے ملاقات ہو جائے گی تو کہہ دیں گے۔ ایسا موقع ہوتا تو صرف چند  
منٹوں میں بات ختم کر دیتے اور فوراً گدیتے ”اچھا جاؤ۔“

مجھے خوب یاد ہے ایک دن میں ”دو منٹے“ کے سامنے سے بڑی  
تیزی سے سائیکل سے گزر رہا تھا سامنے چوتھے پر ٹھل رہے تھے، فوراً پکارا

زرا ٹھہرنا، میں رکا سائیکل کو چوترہ سے لگا کر قریب آنا چاہتا تھا، فرمایا  
نہیں نیچے ہی کھڑے رہو، ایک بات کہنی تھی، وہ تمہارا یا راجندر (شاعر)  
ابکے الہ آباد کے سفر میں ساتھ ہو گیا تھا کیا شعر کہا ہو۔

رند جو ظن اٹھالیں وہی ساغر بن جائے

جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

اس شعر کو اپنے خاص مترنم کسی قدر حزیں لیکن پُر وقار ہی میں پھر پڑھا  
کنے لگے، رشید اس شعر کا کنے والا کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا، الہ آباد  
تک ساتھ رہا بڑا کڑھا ہوا آدمی ہے، اب کبھی آئیں تو ضرور لانا۔ اس شعر  
کی خوبی کی تفصیل پھر کبھی سناؤں گا، اس وقت جاؤ خوش رہو!۔

مرحوم کے ہاں جائے تو کوئی خاص موضوع گفتگو کے لئے مخصوص  
نہ ہوتا، باتوں ہی باتوں میں ایسے ایسے فقرے اور لطیفے کہہ جاتے کہ  
طبیعت باغ باغ ہو جاتی، ہر بات بے غلطہ زبان کہتے ”بے غلطہ زبان“  
انھیں کا فقرہ ہے، کبھی کبھی ایسے الفاظ اور فقرے بھی کہہ جاتے جو ثقافت  
کی زبان پر نہیں آتے لیکن اس پر ہنسی سے اور تباہی جہت سے کہ اس  
لفظ کی ثقافت کی طرف ذہن منتقل نہ ہوتا۔ ان کی باتوں میں حلاوت  
تھی، کبھی کبھی خاص بہار کا کوئی لفظ بول جاتے اور کہہ دیتے کہ یہ خاص  
ہمارے دیا رکا لفظ ہے، ایسا جامع لفظ کہیں اور نہ ملے گا۔

کُرسی ہو موٹھا ہو، صوفاً ہو، تخت ہو بیٹھے ایک ہی وضع سے تھے  
 پاؤں اٹھا کر اور سمیٹ کر۔ اسی طرح بیٹھ کر چائے پیتے، مطالعہ کرتے، لکھتے  
 اور باتیں کرتے نشست کا ہر طرح کا سامان ہوتا۔ چوترے سے متصل  
 نیم دائرہ سائبان میں موٹھے بچھے ہوتے، ایک طرف چارپائی بھی ہوتی  
 بڑے سے بڑا آدمی کیوں نہ آجاتا اس کے لئے کوئی اچھی کُرسی یا صوفاً  
 وغیرہ اندر سے نہ نکالا جاتا۔ جو موجود ہوتا اُسی پر وہ بھی بیٹھ جاتا۔ اور سارے  
 مجمع کو دیکھ کر یہی معلوم ہوتا کہ مرحوم ہی سب پر چھائے ہوئے ہیں۔ کسی سے  
 آج تک مرحوم نے ایسی گفتگو نہ کی جس سے معلوم ہوتا کہ مولانا نووارد دوسرے خوب  
 ہیں یا اس سے خاص طور پر مخاطب ہیں۔ بڑے سے بڑے نواب کو بھی میں نے  
 مرحوم کے پاس بیٹھے دیکھا ہے اور لوگ بھی موجود ہیں لیکن مولانا ہر ایک سے  
 ایک اتار چڑھاؤ سے گفتگو کر رہے ہیں۔ مولانا کا پرانا نوکر یہ تھا اسی طرح نواب  
 صاحب کو چائے کی ایک پیالی لا کر دے گا جس طرح وہ مجمع میں کسی اور کو نہ  
 وہی بے ضبطہ زبان گفتگو وہی نشست، وہی فضا، جس کا جی چاہا اٹھ کر  
 چلا گیا۔ اسی دوران میں مغز نووارد بھی تشریف لے گئے، اور مولانا مرحوم  
 اپنی جگہ پر جوں کے توں باغ و بہار یا کوہ و قاربتے بیٹھے رہے !  
 زندگی میں ہر طرح کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن اکثر  
 محسوس یہی ہوا کہ مخاطب میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ہے۔ کوئی بڑا مخلص

ملا تو اتنا ہی ثقہ اور روکھا پھیکا کوئی ہنسنے ہنسانے والا ہوا تو یہ محسوس ہوا کہ اس میں تھوڑا بہت گنور پن بھی ہے۔ کوئی بڑا عالم قاضی ہوا تو اس میں نخوت تنگ نظری اور کم ظرفی بھی کسی نہ کسی حد تک پائی گئی اللہ والے ملے تو انھیں دنیا کے کام کا نہ پایا۔ کسی منکر خدا کو ایسا نہ پایا جو کچھ اور نہیں رسول کی شرافت و عظمت کا تو قائل ہوتا۔ لیکن مرحوم کی شخصیت انی جامع اور متنوع تھی کہ وہ ہر موضوع اور ہر موقع سے اس خوبی سے عہدہ برائے کہ ان کی صحبت میں جی لگتا اور کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ فلاں جگہ کمی ہے جسے پورا کرنے کے لئے کسی اور کو ڈھونڈنا چاہئے۔

میرا ان کا بیس بائیس سال سے ساتھ تھا، پہلے پہل ملا تو علی گڑھ میں نوادر کس میرس طالب علم تھا، جب ان کا ساتھ چھوٹا ہے تو سب کچھ تھا۔ دوسروں کے نزدیک نہ سہی اپنے نزدیک سہی میں نے بھی اس مدت میں بہت کچھ دیکھا، سنا اور برتا ہے اور اپنے نزدیک اپنی ہر استعداد پر کچھ نہ نہ کچھ اعتماد بھی رکھتا ہوں لیکن اب غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم نے جو سلوک مجھ سے ابتدا میں رکھا وہی آخر دم تک قائم رہا۔ انھوں نے اپنی خدا داد ذہانت و اخلاص سے ہمیشہ وہ سطح قائم رکھی جس کو میں نے اپنے نزدیک اپنی استعداد اور اپنی آرزو کے عین مطابق پایا۔ اسے یوں سمجھ لیجئے کہ مولانا کی صحبت سے جب بھی اٹھتا تو معلوم ہوتا کہ میں نے کوئی کئی اور

اچھی بات سیکھی یا کوئی نیا اور اچھا جذبہ پیدا ہو گیا۔ پریشان و مایوس ہوا  
توان کی صحبت سے ہشاش بشاش اٹھ اُرتھ یا غصہ ہوا تو مرحوم کی باتوں  
سے غم غلط ہو گیا۔ خالی الذہن گیا تھا تو معلومات کے ایسے نادر و لطیف  
نکتوں سے بہرہ مند اٹھا جو شاید مدتوں کے مطالعہ یا مشاہدہ سے حاصل  
نہ ہو سکتے۔

آج کم و بیش دن گیارہ سال ہوئے۔ یونیورسٹی پر تحقیقاتی کمٹی بھی  
چلی تھی۔ بعض دوسرے لوگوں کی طرح مولانا خاص طور پر نزعہ میں تھے۔  
ہر طرف سرمایگی چھائی ہوئی تھی نفسی نفسی کا عالم تھا بڑے بڑے سوراؤں  
کے پاؤں لڑا کھڑانے لگے تھے۔ اس وقت کا حال کچھ وہی لوگ جانتے ہیں  
جن پر وہ عالم گزر چکا ہے۔ اُس زمانہ میں میں نے مولانا کو دیکھا کہ کیا مجال  
کہ روزمرہ کے معمولات میں فرق آجاتا جن کے بارے میں جو رائے رکھتے  
تھے اس کا علی الاعلان اظہار کرتے۔ شام کے وقت برآمدہ میں لوگ بیٹھے  
ہوتے چائے نوشی کی صحبت گرم ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے مصیبت کا  
کیس نام نشان نہیں۔ کسی کی مجال تک نہ ہوتی کہ آنے والی آفت کا تذکرہ  
کرتا۔ ایک دن شب میں میں بھی حاضر ہوا۔ میں مرحوم کی خدمت میں اکثر  
ایسی باتیں بھی کہہ جاتا جو دوسرے کہنے میں ہمیشہ تامل کرتے تھے میں نے  
کہا مولانا کیا ہونے والا ہے خدا نخواستہ نوع دیگر ہوا تو کیا ہوگا۔ کہنے لگے

رشید اقم بھی ایسا کہتے ہو۔ مجھے خیال تھا تم اس قسم کا ذکر نہ پھیرو گے۔ ہو گا کیا وہی ہو گا جو ازل سے تقدیر میں ہو چکا ہو۔ مومن کی شان یہی ہو کہ اس پر ہر اس طاری نہ ہو۔ تم ڈرو گے تو ان لوگوں کا کیا حال ہو گا جو تم کو اپنا سردار سمجھتے ہیں۔ جو ہونے والا ہے وہ ہو چکا ہے پھر ڈرنے سے بچھکنے سے کیا فائدہ۔

مولنا پر اس وقت ایک عجیب جلال سا طاری تھا اور مجھے شہنشاہیت روم کا وہ عہد یاد آ گیا جب گالس نے روم پر قبضہ کیا اور وحشیوں نے فتح کے نشہ میں آکر سینٹ کا رخ کیا جہاں کا ہر رکن اپنی اپنی جگہ متانت اور وقار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جن میں سے ہر ایک کو وحشیوں نے نشست ہی پر بیچ کر دیا لیکن کسی سیٹیر نے نہ اپنی جگہ چھوڑی اور نہ آہ وزاری کی۔

وہ دن گذر گئے جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہو چکا مرحوم بھی جو ار رحمت میں پہنچ گئے، اس وقت میں اس زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کیسا مرد اور کتنا بڑا سردار ہم سے چھین لیا گیا۔ مرحوم میں سرداری کی بڑی بڑی باتیں تھیں تحقیقاتی کمیٹی کا زمانہ کوئی معمولی زمانہ نہ تھا۔ اس وقت صرف مولنا کی ذات ایسی تھی جو اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح قائم تھی مجھے اب بھی یقین ہے کہ مرحوم زندہ ہوتے اور ان کے تاریخی دو منزلہ پر دشمن کے ہوائی جہاز بم برساتے ہوئے تو بھی مولنا کے معمولات میں کوئی فرق نہ آتا



۱۹۲۱ء کا زمانہ ہی، نان کو اپریشن کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہو گئے کی قربانی اور مولات پر بڑے بڑے جید اور مستند لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ اس زمانہ کے اخبارات، تعاریز، تصانیف اور رجحانات کا اب اندازہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ کہا جا رہا ہے وہی سب کچھ ہے۔ یہی باتیں ٹھیک ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور بات ٹھیک ہو نہیں سکتی تھی۔ کالج میں عجیب اذرا تفری پھیلی ہوئی تھی۔ مرحوم مطعون ہو رہے تھے۔ لیکن نہ چہرہ پر کوئی اثر تھا اور نہ مولات میں کوئی فرق۔ اس زمانہ میں میں اسی دو مندرجہ کے عقی کمرؤں میں رہتا تھا اور میرے اور مرحوم کے نشست کے کمرؤں میں صرف ایک دیوار حد فاصل تھی۔ جس میں ایک دروازہ بھی تھا۔ دن میں کئی کئی بار ملنے کا اتفاق ہوتا تھا کہتے تھے رشید دیکھو، علماء کس طرح لیڈروں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں اور لیڈروں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو کیا گھر گھر وندنا بنا رکھا ہے۔ میری سمجھ میں اس وقت ساری باتیں نہیں آتی تھیں، اور نہ میں ان تفصیلات میں پڑنا چاہتا تھا۔ لیکن مرحوم پر ایک خاص کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ رہ رہ کر انھیں باتوں کو چھیڑتے تھے اور کہتے تھے کہ میں جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ کالج اس قسم کے مناقشوں کا

مرکز بنے لیکن کیا کروں، خدا کو تو بعد میں منہ دکھانے کا موقع ملے گا اس دنیا کے لکھے پڑھے لوگ کیا کہیں گے۔

بالآخر مولانا نے ان مباحث پر قلم اٹھایا، اور دن رات قلم برداشت لکھتے رہتے۔ اکثر مجھے بٹھا کر سناتے اور رائے طلب کرتے۔ میں کہتا مولانا میری مذہبی معلومات اتنی نہیں ہیں کہ میں محاکمہ کر سکوں۔ آپ جو کہتے ہیں ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ کہتے یہ بات نہیں ہے تم پر اس طہرکم کا اثر نہیں ہوا اور سمجھتے ہو کہ یہ سینکڑوں علماء جو کچھ کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے اور میں کالج کا مولوی یوں ہی ہانکتا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہم تم زندہ ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق پر!

سیلاب گذر گیا جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا۔ لیکن مرحوم نے اس عہد سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی۔ اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا۔ آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ برقرار ہے۔ سارے علماء سیلاب کے زد میں آچکے تھے۔ صرف مرحوم اپنی جگہ برقرار تھے، اس کا اعتراف کسی نے نہ کیا اور نہ کبھی مولانا نے کہا کہ ہم نے آپ نے مولانا کی اس خدمت اور قابلیت کا اعتراف کیوں نہیں کیا۔ ایک دفعہ میں نے دریافت کیا تو مرحوم نے ہنس کر فرمایا، لیکن میں ان کلمات کو دہرانا نہیں چاہتا۔ اس بدفرنگی اور پیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہی!

شاید تینس سال سے زیادہ کا زمانہ گزرا جو یورپ میں سیرت رسول کا  
جسٹس تھا۔ مرحوم کی تقریر یورپی تھی جلسہ کیا ایک جہم غفیر تھا، مرحوم اپنے مخصوص  
والمانہ جوش و وارنگی کے ساتھ تقریر کر رہے تھے خاموشی کا یہ عالم تھا جیسے  
سارا مجمع ایک ہی تنفس تھا، اتنے میں دو بے ایک بوڑھا پستہ قد، لمبی شخص  
بھکا ہوا انبوہ کو چیرتا ہوا بڑھتا نظر آیا، جس شخص کے پاس سے گزرتا ہے وہ  
خوف و عقیدت سے سمٹ کر تعظیم دیتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم پر پہنچ  
گیا، مرحوم کو سینے سے لگا کر پیشانی کا بوسہ دیا اور واپس چلا گیا یہ مولانا ہدایت  
اللہ خاں صاحب جبروت جو یورپ مرحوم کے استاد اور جو یورپ میں اس  
وقت علم و فضل کے چمک و چراغ تھے۔

مرحوم میں اپنے استاد ہی کا جبروت و طنطنہ تھا ان کی شفقت میں  
بھی جبروت کا رہا تھا۔ میں نے مرحوم کو جھجھک کر یا گول گول باتیں کرتے  
کبھی نہ پایا۔ ایک بار میں مرحوم کی خدمت میں حاضر تھا۔ یونیورسٹی کو ایک  
بہت بڑے آدمی نے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا مولانا براہ  
نوازش آج شب کا کھانا غریب خانہ پر بنا دل فرمائے۔ مولانا نے بغیر کسی  
تامل کے بے لاگ کہا۔ نہیں جناب میرا آپ کا کھانا کھاتا نہیں ہی نہیں  
ہو سکتا۔ وہ صاحب بڑے خفیت ہوئے لیکن مرحوم پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔  
ہم سب سخت متحیر ہوئے۔ آخر میں مرحوم نے فرمایا، جی ہاں میرا ان کا کوئی

کھاتا نہیں ہے۔ اس قسم کے کتنے اور واقعات ہیں، کئی سال کی بات ہے مرحوم  
 اجیر شریف جا رہے تھے اتفاق وقت جس گاڑی سے مرحوم سفر کرنے  
 والے تھے اسی سے ایک بڑے ذی وجاہت بزرگ کایونیورسٹی کی طرف  
 سے خیر مقدم تھا۔ ان سے مولنا آزر دم تھے، انہوں نے شاید یہ سمجھا کہ  
 مولانا بھی ان کی پذیرائی کے لئے تشریف لائے تھے۔ دل میں خوش ہو کر  
 آگے بڑھے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مولنا نے بغیر کسی پس و پیش کے  
 فرمایا، ”جی“ اس سعادت کے لئے دوسرے آئے ہوئے ہیں میں ہاتھ نہیں  
 ملاتا۔ یہ لکڑا اپنے ڈبہ میں سوار ہو گئے۔

آج تک کسی بڑے آدمی کی آمد یونیورسٹی کے کسی جلسہ میں شریک  
 نہ ہوئے کسی بڑے آدمی کے گھر نہ جاتے تھے تا وقتیکہ اُس سے یارا نہ نہ ہوتا۔  
 مجھے معلوم ہے مرحوم کی ایسوں ایسوں سے بھی گہری دوستی تھی جن کو  
 دین و مذہب سے دور کا بھی سروکار نہیں اور ایسوں سے بھی تھی جو اپنے  
 وقت کے بڑے جید عالم دین سمجھے جاتے تھے، ہر شخص محبت و احترام کے  
 جذبات لے کر آتا تھا اور مطمئن و مسرور واپس جاتا جس سے طبیعت نہ  
 ملتی تھی کبھی اس کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی کہ مرحوم کی صحبتوں میں بٹھ سکے،  
 مرحوم اس معاملہ میں بڑے کھرے تھے۔ کبھی دنیا سازی کی خاطر کسی کی  
 تالیف قلوب نہ کی، لیکن جن سے خاص تعلقات تھے اُن پر جان چھڑکتے

تھے اس کی تکلیف سے مضطرب ہوتے اور اُس کی خوشی سے باغ باغ ہو جاتے۔

مولانا کے خلاف اخباروں میں بڑے نامعقول مضامین نکلے اور اکثر ایسے ناروا اور رکیک حملے کئے گئے کہ انھیں یاد کر کے آج تک میرا دل کڑھتا ہوا اور کھٹنے والوں سے مجھے قلبی نفرت پیدا ہو گئی ہے لیکن مولانا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ آج تک میں نے ان کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا نہیں سنا جس سے اندازہ کیا جاسکتا کہ مولانا پر اس کا کوئی اثر ہے ایک دن معلوم نہیں کونسا موقع تھا اس اخباری گندگی کا تذکرہ آیا تو مرحوم نے فرمایا اور اپنے مخصوص قلندرانہ انداز سے ”چلو آگے بڑھو۔ یہ نہیں دیکھتے کون کہہ رہا ہے۔ صاحبزادہ ہو یہی دیکھتے ہو کہ کس کے خلاف کہہ رہا ہو لڑائی مجھے پسند ہے لیکن ببادروں سے بیسواؤں سے نہیں!“

مرحوم کی شخصیت کا ایک عجیب کمال تھا جس کو میں محسوس تو کرتا ہوں لیکن وضاحت نہیں کر سکتا، ممکن ہے مثال دینے سے یہ بات کسی قدر واضح ہو جائے مرحوم کے دن رات کے اٹھنے بیٹھنے والوں میں فرداً فرداً کوئی خاص جاذبیت نہ تھی لیکن ہی لوگ جب مرحوم کے حلقہ میں بیٹھے ہوتے تو یہ جموعہ نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا اور ہر شخص فرداً فرداً نہایت دلپذیر اور یہ بات کچھ افراد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ مرحوم کے

کمرؤں کے اندر جو چیز جہاں رکھی ہوتی اس میں بھی ایک خاص نش نظر آتی۔ کم و بیش بیس سال سے مرحوم کے کمرؤں کے اندر کی تقریباً تمام چیزیں میری نظروں میں ہیں جو چیز جہاں آج سے بیس سال پہلے دیکھی تھی وہ آج تک موجود تھی کرسیوں کی وہی ترتیب کتابوں کی الماری اسی جگہ پر تخت کی وہی جگہ وہی پوشش، کھونٹیوں کا وہی مقام، باندان اسی کرسی پر، چھوٹے چھوٹے ٹیکس اور ٹوکریاں، تخت کے پائیں لاشہ برگھڑی، بوتل چائے کا ڈبہ، دو چار پیالیاں، تھلی ہوئی دسلف پر بادامی کاغذ پر چھپی ہوئی کتابوں کا انبار، تخت کے اوپر کھونٹیوں پر لٹکی ہوئی قیمتی کپڑوں کی شیر و انیاں، اور خوش رنگ صاف ایسا معلوم ہوا جسے مرحوم کی شخصیت کے یہ سب عناصر ترکیبی ہیں۔ اب ادھر سے گزر رہا ہوں تو دو منزلہ کی طرف اٹکھ اٹکھ کر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی اور دل جھبر آتا ہے۔

میرا پہلا مکان دو منزلہ ہے بہت قریب تھا، مردانے کے بیرونی دروازہ کے سامنے سڑک کی دوسری جانب درختوں کی جھلملی میں دو منزلہ کا قوسی برآمدہ اور چوترا نظر آتا تھا، گھر میں کوئی زیادہ بچہ نہ ہوتا، طبیعت پریشان رہتی تو نہ کہیں جانا اچھا معلوم ہوتا اور نہ گھر کے اندر رہنے کی ہمت پڑتی تھی، کبھی کبھی دروازہ سے باہر نکلتا تو مرحوم اپنے

چوتراہ پرلمی کشادہ آستینوں کا سپید کرتہ پہنے سیر پر گول فخل کی ٹوپی اور  
 پاؤں میں دلی کی نازک پیر زر جوتی پہنے سر نیچے کئے ہوئے دونوں ہاتھ  
 کر پر باندھے تیز تیز قدموں سے چل قدمی کرتے نظر آتے دیکھ کر دل کو ڈھارس  
 ہو جاتی سوچتا کہ مرحوم اس وقت کوئی نہایت ہی اچھا شعر گنگنا رہا ہو  
 ہوں گے اگر چلا جاؤں تو وہ اس طور سے خیر مقدم کریں گے کہ طبیعت  
 بحال ہو جائے گی۔ پس اتنا ہی احساس میرے تسکین قلب کے لئے  
 کافی ہوتا۔ میں مکان کے اندر آجاتا اور دعا کرتا کہ خدا اطمینان دے  
 تو مولنا کے ہاں جاؤں اور جی بھر کر ان کی شفقت، مرحمت اور لطافت  
 و مہربانی سے جی سیر کروں۔

مرحوم کو میرے بڑے لڑکے اقبال سے بڑا انس تھا حالانکہ ان  
 کا تمام عمر کسی بچے سے سابقہ نہیں ہوا تھا وہ صرف چند عینوں کا تھا  
 کہ اسے بلا بھیجے۔ گو وہیں بٹھاتے اس کا نام کدور کھا تھا، پیشاب کر دیتا  
 تو کہتے اے کدو تو نماز نہ پڑھتے دے گا، اچھا کوئی ہرج نہیں کریشا۔  
 بڑا ہو گا تو کہے گا مولنا اب پریشاب کر چکا ہے جب وہ پاؤں پاؤں  
 چلنے لگا تو اپنی دونوں ہاتھ کی انگلی اس کے ہاتھ میں دے دیتے اور  
 کہتے ناچ بے کدو ناچ۔ اس کے بعد اپنے مخصوص دلنشین لیکن پُر  
 وقار سخن میں کہتے توم توم رے بابے تومری توم توم رے بابے تومری

ہاں نایب بے کد و نایب۔

سال ڈیڑھ سال کا تھا کہ ایک دن شام کو اقبال کو بیکہم پور چلے گئے، بغیر ہم سب کو اطلاع کئے۔ دوسرے دن واپس گئے۔ لیکن خوش معلوم ہوا کہ بچے نے بالکل تنگ نہیں کیا۔ لیکن مرحوم تمام رات اس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ انھوں نے بالکل اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ وہ بیکہم بغیر کسے سنے کیوں اقبال کو بیکہم پور لے گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد ایک بار دو دن کے لئے بغیر کسے سنے اقبال کو ٹونڈلہ پیکر چلے گئے۔ ایک دن اسی زمانہ میں بیکہم کو دیکھ کر کہنے لگے کہ و تیرا باپ تجھے کپڑے نہیں پہناتا اچھا دیکھ تیرے لئے میں کپڑا بناؤں گا۔ چند ہی دنوں بعد دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت ہی پُر تکلف اچکن پہنائے ہوئے حسب معمول اسے بجا رہی ہیں۔ حج کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں سے اقبال کے لئے ایک نہایت خوبصورت چغہ اور عقال لائے۔ اقبال رات میں روتا تو صبح کے وقت مولنا کا آدمی ضرور آتا کہ رات کو کدو کیوں رویا۔ اسے بھیج دو۔ اقبال بڑا ہوا تو اکثر کھانے پینے کی چیزیں خود لیکر جاتا، مرحوم بہت خوش ہونے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ دے کر واپس کرتے۔ کھانے پینے کی چیزیں، میوے، پھل ہمیشہ بھیجتے رہتے۔ اور کہلا بھیجتے کہ یہ کدو کے لئے ہے۔ وفات سے سال سوا سال پہلے صحت اچھی نہیں رہی تھی۔ اقبال کچھ لے جاتا تو کہتے اے کدو اب میں



بیمار ہوں اور بڈھا ہو گیا۔ اب تیری لائی چیز کیسے کھاؤں۔  
اکثر کہا کرتے اقبال کو میرے ہاں بھیج دیا کرو میں اسے عربی فارسی  
پڑھاؤں گا۔ اب کدو بڑا ہو گیا۔ اب نہیں ناچے گا اس لئے اب اسے دوسرا  
ناچ نچاؤں گا اقبال کچھ دنوں تک بہت بیمار رہا، میں پریشان رہنے  
لگا، مرحوم نے سنا تو فرمانے لگے۔ ارے کدو کا جگر خراب ہے گھبراؤ نہیں  
کوئی بات نہیں، ڈاکٹروں کی بات میں نہ آؤ یہ کتابی باتیں بتاتے ہیں،  
مریض کو نہیں پہچانتے، پہاڑ لے جانا چاہتے ہو تو لے جاؤ، فائدہ ہوگا۔ لیکن  
کدو سے کدو ناچتا رہے۔ توم توم رے بابے تو مری!

میرے مضامین کے بڑے شائق تھے، خود پڑھتے اور اپنے مخلصوں  
اور بے تکلف دوستوں کو سناتے، میں ملتا تو مضمون کے بارہ میں اپنا  
رائے بھی سنا دیتے اور یہ بھی بتا دیتے کہ کن کن کو انھوں نے مضمون سنا یا  
اور کس کس نے کیا کہا۔ لیکن اکثر اس کے خلاف بھی ہوتا، ایک دن یونیورسٹی  
آفس سے اتر کر اسٹریٹ جی ہال کی طرف آ رہے تھے، میں سڑک سے گزر رہا تھا  
سلام کیا بولے، اچی یہ تم کیا مہل لکھنے لگے ہو۔ اس دفعہ کا مضمون بڑا نونو  
تھا، ہاں بالکل بے سرو پا۔ اچھا جاؤ اپنا کام دیکھو، میں نے چاہا کہ کچھ کول  
کنے لگے بس بس آج اتنا ہی وہ دیکھو تمہارا یا رارہ ہے۔ جاؤ!

مرحوم کی سیرت کا ایک خصوصی پہلو یہ تھا وہ جو چیز رکھتے تھے اس میں

کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہوتی بڑی دلکش ہوتی، بڑی قیمتی ہوتی یا اس کے ساتھ کوئی خاص روایت وابستہ ہوتی، ہمیشہ پاکیزہ قیمتی اور مردانہ وضع کے لباس پہنتے، گراں قیمت اور نادار قسم کے اونٹنی کپڑوں کا بڑا شوق تھا شیروانی یا رونی دارا چکن کا کپڑا بڑا صوفیانہ اور دلکش ہوتا۔ ایک دفعہ افغانستان سے ایک گرم عبا منگائی تھی، فاختی رنگ کا کپڑا جس پر لکھنے ہوئے ریشمی پھول کاڑھے گئے تھے۔ ایک دن میں پہنچا تو بولے خوب لگے۔ کچھن وہ عبا تولانا، یہ بھی کیا کہیں گے کہ مولوی کے پاس کیسے کیسے مال غنیمت ہیں۔ عبالائی گئی بڑے شوق سے پہنا، بولے کیا رائے ہے، میں بہت قریب پہنچ کر دیکھنے لگا۔ اس پر ہاتھ پھیرا اور ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کرنے لگا۔ بولے خیریت تو ہے اس قدر انہماک کا اظہار کیوں کیا جا رہا ہو؟ میں نے عرض کیا کیا کہوں۔ اسی طرح کی ایک چیز اس دن جلسہ میں اب منزل اللہ خاں کو پہنے دیکھا تھا، اُن کے قریب تو جانے کی ہمت نہ ہوئی آج آپ کے پاس ویسی ہی چیز دیکھی تو کہا موقع اچھا ہے اس تحت طاؤس کو ذرا چھو چھا بھی لوں بڑے زور سے ہنسے، کہنے لگے باز نہ آؤ گے اچھا ایک پان بناؤ اور یہ تو بتاؤ وہ تمہارا یا رذا کر کہاں ہے بڑا مرد آدمی ہو؟ ذرا صحبت اچھی نہیں ہے، میں نے کہا جی ہاں ان دنوں صحت اچھی نہیں ہو، بولے یہ کیا، میں کہتا ہوں اس کا ساتھ نامعقولوں سے پڑا ہے تم کہتے ہو

صحت اچھی نہیں پھر آواز دی جہاں ایک شہر میں رشید کے لئے پندی  
تولانا۔

مردم کے معمولات بھی غیر معمولی تھے۔ سردیوں میں باہر سوتے تھے،  
ابتداء میں تو بالکل سخن میں لیکن ادھر چند سالوں سے برآمدہ میں آرام کرنے  
لگے تھے۔ گرمیوں میں اندر رضائی اوڑھ کر بستر گزار، چادریں تھکھی ٹنگے  
متعد پٹیکے کا کوئی دستور نہ تھا۔ گرمی میں نہ برف کا پانی مل سکتا تھا نہ  
سردی میں گرم پانی۔ ہمیشہ کہتے تھے کہ پینہ آنا بہت اچھا ہی۔ شام کا نہانا  
اور دھوپ میں بیٹھنا منع کرتے تھے۔ دوسرے کے تولے یا رومال سے  
ہاتھ نہیں پوچھتے تھے، ننگے منہ نہ دیکھے جاتے تھے، گفتگو بلند آواز سے کرتے۔  
کانا پھوسی گوارا نہ تھی عمامہ اکٹھے بلکہ زعفرانی رنگ کا ہوتا اور جوتی لٹی  
کی پرزور ٹہل کا لمبا بڑی کشادہ آستینوں کا کرتہ پہنتے۔ جس کے پیچھے  
ہمیشہ ٹہل کی بٹن دار صدری ہوتی۔ کپڑا قیمتی اور شریفانہ رنگ اور  
وضع کا ہوتا۔ کسی کو اچھا کپڑا پہنے دیکھتے تو خوش ہوتے اور تعریف کرتے  
ناپسند ہوتا تو کہہ دیتے۔ سالن بڑی تیز مچول کا پسند تھا۔ ہمیشہ چٹائی پر گرہوں  
بیٹھ کر کھاتے نوکروں کا بڑا پاس رکھتے۔ لکھنے میں سطر کبھی نہیں سیدھی  
ہوتی جسے دوست رکھتے اُس سے نہایت خوش ہو کر آگے بڑھ کر جی  
کھول کر ملتے اور کوئی نہ کوئی خوش طبعی یا خوش دلی کا فقرہ ضرور کہتے۔

مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے نہ کسی کے علم سے نہ کسی کی دولت سے نہ کسی کے اقتدار سے۔ مذہبی عقائد میں کٹر سلوک میں بے لوث جو جتنا چھوڑا ہوا اس سے اتنی ہی فروتنی سے ملتے۔ بڑا ہوتا تو اس سے کہیں اوپر بڑا ہو کر ملتے، علم کا وقار ان کے دم سے تھا۔ معزز و محبوب مولوی میں نے ان ہی کو پایا، "اقدیمانہ، رنگ صاف، جلد روشن، اعضا پتے، نقشہ نرم و نازک، آنکھیں چھوٹی جن میں جذبات کا اتار چڑھاؤ جھلکتا رہتا، نظیر و مبرا اختلاؤ انداز میں بائپن، انگلیاں ایسی جن میں قلم شمشیر و رباب سبھی زیب میں آوا میں کڑک اور نچک، دھمک بھی۔ خطابت پر اتنے تو معلوم ہوتا صغیر لٹ دیں گے، نماز پڑھاتے تو معلوم ہوتا کہ خدا کا کلام دوسروں کو پہنچانے میں اپنی اور اپنے مالک دونوں کی عظمت کا احساس ہو۔"

جمعہ کی ایک نماز یاد ہے، جاڑے کے دن تھے، سب بھری ہوئیں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا رگ و ریشہ میں سوئیاں بن بن کر اترتی جاتی ہیں۔ ناظم صاحب دینیات غالباً موجود نہ تھے۔ مرحوم امامت کے لئے آگے بڑھے، بکیر بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ مولانا نے کہا، اللہ اکبر ایسا معلوم ہوا جیسے اس صدف نے فضا کی ہر صدا کی لرزش چھین لی۔ اس کے بعد جو آواز شروع کی، ہی تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے خاک کی تلوار میدان جہاد میں کوندتی لرزتی گرتی چلتی کاہی، سنٹی تیرتی ابھرتی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ کوئی لمبی سورت

تھی۔ جب تک ختم نہیں ہوئی یہ معلوم ہوتا تھا جیسے جسم و جان میں بجلیاں  
 بھڑک رہی ہیں۔ اور شوق خود سپاری میں ہمیں نہیں درود پوار بھی چھوڑ  
 رہی ہیں اس دن کی نماز اب بھی یاد ہے اور ہاں اس پر ایمان بھی  
 ہو کہ وقت آگیا تو شوق شہادت دنیا کے ہر شیب فراز اور زندگی کے  
 ہر تامل و تذبذب کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا!!  
 مرحوم ایسوں سے کبھی علمی گفتگو نہ کرتے جن کے بارہ میں ان کو یقین  
 ہوتا کہ اس کو علم کا گھنڈہ یا علم کی گہرائی یا وزن نصیب نہیں ہی یا صرف  
 دنیوی اقتدار کا حامل ہے اگر کوئی چھپر بھی دیتا تو ٹال جاتے ورنہ صاف  
 کہہ دیتے کہ کوئی دوسری بات کیجئے آپ کو ان باتوں سے کیا سروکار!  
 البتین شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ سراقبال مرحوم کو بھی بھیجا  
 تھا۔ اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد اقبال مرحوم اپنے لکچروں کے سلسلہ میں  
 علی گڑھ تشریف لائے۔ کھانے پر ایک جگہ مرحومین کی ملاقات ہو گئی۔  
 البتین کا ذکر چھپر گیا۔ سراقبال مرحوم نے بڑی تعریف کی اور فرمایا مولانا  
 آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن  
 کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن نہیں منتقل ہوا تھا۔ گفتگو ہوتے ہوتے ایک موقع  
 ایسا آیا جب سراقبال مرحوم نے فرمایا کہ ”مولانا دوسرے ایڈیشن میں  
 اگر اس بحث کو بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیجئے تو بہتر ہوگا۔ ایک ذی وجہات

بزرگ جن کو نیوٹرٹی کے نظم و نسق میں کافی عمل دخل تھا اور اپنے سٹس سال اور قومی خدمات کے اعتبار سے بھی علی گڑھ کی دنیا میں بہت کچھ اہمیت حاصل تھی۔ مرحومین سے ذرا فاصلہ پر دسترخوان پر موجود تھے۔ وہیں سے آواز دی ہاں مولانا میری بھی وہی رائے ہے جو سراقبال نے دی ہو، دوسرے ایڈیشن میں.....“ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ مرحوم نے لکھا کہ..... صاحب بس کیجئے آپ کھانا کھا لیتے، آپ کو ان باتوں سے کیا نسبت ان باتوں میں نہ پڑے۔ کھانا کھا لیتے۔ ملاحظہ فرمایا نہ۔ ہاں بس کھانا کھائے جائے!“

ایک اور بزرگ جن کے بارہ میں کچھ کہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ دنیات کے نصاب سے کچھ لینے لگے، کتابوں پر جہاں تہاں نشانات لگا کر مرحوم کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ توقع یہ تھی کہ مرحوم تباد کہ خیالات سے ان کی عزت افزائی فرمائیں گے۔ مرحوم نے تحریری کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک صاحب سے یہ البتہ کہلا دیا کہ کتابیں موصول ہوئیں۔ انہوں نے اسی کو غنیمت سمجھا ایک دن حلقہ چائے نوشی میں آکر شریک ہوئے اور تھیا لوجی کا تذکرہ چھیڑ دیا، مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا، آپ کو دنیات سے کیا واسطہ، آپ کے اپنے مشاغل کیا کم ہیں کہ دنیات کی طرف توجہ فرمائیں۔ وہ صاحب خفیف ہو کر خاموش ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر

میں آموں کا تذکرہ آگیا۔ اس میں نووارد نے بڑی انہماک سے حصہ لینا شروع کیا۔ مرحوم نے فرمایا یہ ٹھیک ہے۔ اس پر گفتگو کیجئے۔ ملاحظہ فرماتے ہوئے یہ آپ کا حق ہے !

کچھ دنوں کی بات ہے کہ مرحوم کے ہاں ایک بڑے سن رسیدہ بڑے بزرگ اور بڑے جید عالم ٹہرے ہوئے تھے آپس میں بے تکلفی تھی ورنہ ظاہر ہو خاتما ہ میں کسے نیند آسکتی تھی، چلے کی سردی تھی، مرحوم حسب معمول برآمد میں سو رہے تھے اور ہمان کمرہ کے اندر ہمان تہجد کی نماز پڑھنے آئے فروزا کھولنے پر مرحوم کی آنکھ کھل گئی۔ پوچھا کون؟ جواب ملا کونئی نہیں میں ہوں۔ بولے خیر تو ہے کما وضو کروں گا بولے تو کیجئے نہ کسی کی نیند کیوں حرام کرتے ہیں۔ انھوں نے دبی زبان سے کہا، تھوڑا گرم پانی مل جاتا۔ فرمایا جہنم میں ہمان نے کہا مکررا رشا دہو پورے طور پر سن نہ پایا، بولے گرم پانی جہنم میں ملے گا، انھوں نے جواب دیا۔ تو اٹھو راہ بناؤ، مرحوم نے قمقمہ لگایا، بولے نیند تو غارت کی لیکن فقرہ خوب کہا !

ایک دن کلاس پہنچے، خلاف معمول بہت کم لڑکے نظر آئے پوچھا کیا بات ہو، معلوم ہوا، باہر سے کوئی مشہور کرکٹ ٹیم آئی ہوئی ہے، بڑے معرکہ کا میچ ہو رہا ہے۔ ایک لڑکے نے کہا مولنا چھٹی دے دیجئے تو ہم سب بھی دیکھ آئیں، بولے ہاں چھٹی ہے، مقصود حاضری تھی، لڑکے نے جواب دیا مولنا

حاضری لیجئے گا تو بہتوں کا نقصان ہو جائے گا۔ فرمایا حاضری اپنی مقصود  
 تھی، تمہاری نہیں، جاؤ جاؤ تم بھی پیچ دیکھ آؤ! بہت دنوں کی بات ہے کہ میں کلاس میں لوانح جامی اور گلشن  
 راز پڑھا یا کرتا تھا۔ ان میں بعض مقامات میری سمجھ میں نہ آتے تھے  
 کبھی کبھی اپنی دقتیں لے کر مرحوم کے پاس پہنچ جاتا۔ بڑے خوش ہوتے  
 کہتے بیٹھو، میں کتنا مولنا کلاس شروع ہونے والی ہے۔ صرف چند مقامات  
 ہیں جہاں اُٹکتا ہوں۔ فرمایا یہی تو مصیبت ہے تفصیل سے باتیں نہیں سنتے  
 تھوڑا سا پالینا اور بھاگ نکلے، طالب علم یہ نہیں کرتے یہ کام اٹھائی گیروں  
 کا ہی۔ پگڑیاں ہوں یا ڈگریاں سب اٹھائی گیرے، علم کی عظمت باقی نہیں  
 رہی تو طالب علم میں سعادت کہاں سے آئے، میں نے کہا مولنا کتنے ہونے  
 والا ہی آخر اٹھائی گیروں پر بھی تو برا وقت آتا ہے کہتے اچھا اچھا، بولو پڑھو،  
 میں پڑھنا شروع کرتا۔ پیچ ہی میں روک دیتے۔ کہتے معلوم ہے پھر اس  
 کی وضاحت کر دیتے اور چلنے لگتا تو کہتے دیکھو پھر کہتا ہوں قرآن پڑھ دالو  
 لوانح جامی اور گلشن راز کلاس میں پڑھا دو گے لیکن قرآن پڑھتے بغیر  
 لکھے پڑھوں کے مجمع میں ان مباحث کو مت چھیڑنا۔ آگے تم جانو تمہارا  
 کام اور ماں ایک پان کھاتے جاؤ۔ میں نے کہا جی نہیں کلاس بھاگ  
 جائے گی۔ کہتے ٹھیر و ٹھیر و پڑھانا تاہی تو کلاس بھاگ جائے تو بھاگ جائے پڑھنے



وہ انتظار کرتے رہیں گے۔ پان تو کھاتے ہی جاؤ!  
 ایک بار چائے نوشی کی صحبت گرم تھی۔ سارے درویش موجود تھے  
 ایک صاحب تھے جن کو خانقاہ سلیمانہ میں لائف ممبری کا درجہ حاصل نہ تھا  
 لیکن اکثر بار پاجاتے تھے۔ مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے علم و فضل  
 کا تذکرہ تھا کہ متذکرہ صدر بزرگ بھی آپہنچے۔ یہ مولانا لطف اللہ صاحب جو  
 کے شاگرد تھے، چنانچہ آنے کے ساتھ ہی گفتگو میں شریک اور تعریف و  
 میں سب سے پیش پیش نظر آنے لگے۔ مرحوم نے چائے کا ایک دگھتا ہمکنہ  
 نیم جوہ لیتے ہوئے فرمایا بھائی میں تو مولانا لطف اللہ صاحب کی کرامت  
 کا بھی قائل ہوں۔ نو وارد نے تعجب میں آکر پوچھا مولانا یہ کیونکر مرحوم  
 نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا ”اور جو انھوں نے آپ کو پڑھا دیا یہ  
 نہیں تو اور کیا ہے!“

کئی سال ہوئے ایک رات گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ زانی سوا  
 آئی ہوئی ہیں میں نے کہا چلو مولانا کے ہاں ہواؤں، پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں  
 کلاسکل چھوٹی گول میز کے سامنے اپنی کرسی پر پاؤں اٹھائے اکڑوڑ  
 ہوئے کوئی چیز بڑے غور سے پڑھ رہے ہیں۔ میں نے کہا مغل تو نہیں  
 بولے بیٹھ جاؤ، ابھی بتاتا ہوں، میں بیٹھ گیا، عینک کے اوپر سے نگاہ  
 بولے ٹھکانے سے بیٹھو، گپ ہوگی تھوڑی ہی دیر میں پرچہ علیحدہ رکھ دیا۔

کو اس کے خانہ میں رکھا پھر بولے سنو۔  
 ادھر رہ گئی یا ادھر رہ گئی  
 وفا کی شکایت مکر رہ گئی  
 ”بے نظیر شاہ“ کو جانتے ہوئے میں نے کہا جی، شاہ صاحب کب کون نہیں جانتا  
 کہنے لگے اور سنو۔

ازل میں ہر انجام لکھا گیا  
 شبِ غم کی لیکن سحر رہ گئی  
 بولے یہ شخص چھوٹی بحر میں کہنے کا بادشاہ ہے، میں نے کہا درست بادشاہوں  
 کا کیا کہنا، بے اختیار ہو کر فرمایا، وہ بھی ٹھیک کہتے ہو، ہاں ہاں ہم سمجھے  
 بادشاہوں کا کیا کہنا۔

میں نے کہا تو کیا اسی کا مطالعہ ہو رہا تھا، فرمایا نہیں، یہ نہیں، ایک  
 اشتہار تھا، میں اشتہارات اکثر پڑھ لیا کرتا ہوں اس سے تمہاری قوم  
 کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ دوا کا اشتہار تھا۔ دنیا میں اور امراض  
 کی دواؤں کا بھی اشتہار دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں صرف ایک  
 ہی مرض ہے، جدھر دیکھو اسی کا چرچا، جس طرف دیکھو قوتِ مردمی کا  
 ماتم، جہاں دیکھو مایوس العلاج، اس سے اندازہ کرو کہ ہمارے کیا کرتوت  
 ہیں، کیا خیالات ہیں اور ہم کدھر جا رہے ہیں اور پھر یہ بھی تو دیکھو تمہاری

اُردو کہاں جا رہی ہے۔ شروع سے آخر تک یہی اشتہارات یہی مرض  
میں نے کہا جی ہاں فرمایا اچھا اچھا کھانا کھا لیا ہے میں نے کہا  
جی نہیں کہنے لگے یہ بھی اچھا ہوا۔ میں کھالوں تو گپ ہوگی تمہیں نہیں  
کھلاؤں گا۔ آج کل صرف ایک پھلکا اور کدو گوشت کا سیٹھا پھیکا  
شوہر ہوتا ہے۔ بھوک لگی ہے؟ میں نے کہا جی ہاں وہ تو قائم سی  
ہو گئی ہی بنے اوزدی چا نکلیوں کے لڈولاؤ۔

لڈو آئے تو پلے کھا لو منیر کے ہیں منیر کے منیر کا نام سنا ہے۔  
میں نے کہا جی ہاں۔ خط و کتابت بھی رہی ہے بولے ہائیں یہ کیا ہیں  
نے کہا وہی ”براورم شمس الدین وزین الدین“ بنے فرمایا خوب یاد  
رکھا اور ہاں ایک کدو کے لئے لیتے جانا۔ کدو اب بڑا ہو گیا۔ ہاکی کھیلنا  
ہی۔ خوب ناچتا تھا۔ کدو کہیں کا!

کھانے سے فارغ ہوئے جب معمول صراحی سے براہ راست  
حلق میں پانی اوڈیل کر لیا ہاتھ دھوئے اور اپنے سرخ لمبے چوڑے  
رومال سے ہاتھ منہ پونچھتے ہاں ہر نخل کرچو ترے پر مونڈھے پر بیٹھے گئے  
تھوڑی دیر تک خلال کرتے رہے میں نے پان بنا کر دیا اسے لے کر منہ  
میں رکھا مونڈھے سے ذرا ایک طرف مائل ہو کر پہلی بیک براہ راست  
پتیل کے چکدارا گلدان میں ڈالی جو ٹھیک سوراخ میں جا گری

اور اوگالداں کے حاشیہ پر پھینٹ تک نہیں آئی۔ مرحوم اسی طرح اپنی اونچی کرسی پر اُگڑوں بیٹھے بیٹھے نیچے اوگالداں میں پیک ڈالتے تھے اور کہیں ادھر ادھر اوگالداں پر پھینٹ نہ پڑتی۔

فرمی مہینہ کا شاید یہ تیسرا ہفتہ تھا، اکتوبر کا مہینہ، رات کسی قدر بھینکنے لگی تھی چاند افق سے کچھ ہی بلند ہوا تھا لیکن اس کا مدھم منکاں جالا درختوں کی پتیوں اور عمارات کے کنگروں پر نمایاں ہو چکا تھا بوسے کل رات میری طبیعت گھرائی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں بالآخر دل میں آیا کہ فردوں سے گفتگو کروں، کو کیا سمجھے، میں نے کہا بالکل نہیں سمجھا، کہا ہاں فردوں سے۔ پھر اس کی وضاحت کی فرمایا۔ میں نے وہ پلندہ نکالا جس میں ۲۵-۳۰ برس کے خطوط رکھے ہیں۔ عزیزوں دوستوں میں سے جو وفات پا چکے ہیں ان کے خطوط۔ وہ خطوط جو انھوں نے زندگی میں لکھے تھے ان سب کو نکالا۔ بعض بالکل شکستہ تھے بعض کی سوادِ تحریر بے نور ہو چکی تھی۔ بعض اس طرح لفافوں میں رکھے ملے جیسے ان کو میں نے کھولا ہی نہیں تھا۔ مہر س تک کھینکی پڑ گئی ہیں۔ انھیں میں نے بڑی احتیاط سے کھولا۔ ڈر کر محبت سے کبھی بے اختیار ہو کر کبھی مسرور ہو کر کبھی جھجک کر کھولا۔ ان سے باتیں کیں۔ وہ زمانہ یاد آ گیا جب زندگی عبادت تھی ان کے خلوص سے ان کے جھگڑوں سے ان کی فرمائشات سے۔ کسی میں کسی کے آنے کا فردہ

تھا کسی نے بلایا تھا کسی نے مجھے پریشانی میں شکنیں دی تھی۔ پھر میں بالکل بھول گیا کہ یہ لوگ درجکے ہیں مجھے یقین ہو گیا کہ سب زندہ ہیں، میں ہی درجکے ہوں۔

پھر بلے، اور نہایت رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگے، تم تو جانتے ہو بیٹائی صاحب مرحوم پورے پاگل تھے۔ میں نصف پاگل ہوں۔ کبھی کبھی پورا پاگل ہو جاتا ہوں۔ اس وقت ناواقف مجھ سے آزر رہے ہو جاتے ہیں لیکن جو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں۔

ہاں تو عجیب عجیب خطوطے۔ پاگل کا ذہن تم کو معلوم ہے کبھی کبھی ایسا سرخ السیر، ایسا شفاف اور ایسا رنگین ہو جاتا ہے کہ بس..... اس کا احساس صرف پاگل ہی کو ہو سکتا ہو۔ تم کو ہوتا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں لیکن ہو کر رہے گا خوش ہو گئے۔ کہا ایک یان اور بناؤ۔ میں ذرا پانی پی لو۔ پان کھا کر اور پانی پی کر تھوڑا اٹلے پھر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے یہ ذہن اور اس کے تصورات عجیب ہیں۔ پاگل کی ذہنی سطح ذی حواس کی ذہنی سطح سے بہت بلند ہوتی ہی بہت وسیع اور نہایت بامعنی۔ وہ تمہاری عقل اور ہمتا سے اکتسابات شعوری غیر شعوری سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کے تصورات زیادہ منجملہ ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت پالیتا ہے۔ نتیجے میں استنباط کرتا اس کو نتیجہ استنباط کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

ہاں تو..... کا خط دیکھ رہا تھا معلوم ہوتا تھا سناٹے موجود ہے۔  
میں نے اسے چھوا۔ میرا گھر بنوا رہا تھا۔ محبت سے محنت سے۔ یہاں دوڑ  
کر جاتا ہے وہاں سے آواز دے رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے رگ گئے۔  
پھر پوئے..... کو جانتے ہو؟ میں نے کہا پورے طور پر یاد نہیں کئے  
لئے وہ بھی موجود تھے۔ جوں کا توں لفافہ میں بند پھر کے کئے لگے سب موجود  
ہیں۔ خوب بات کرتے ہیں بہتے ہیں باب قبرستان میں سوتے ہیں لیکن میرے  
ہاں بہتے پوتے ہیں۔ سبھوں کو بند کر رکھا ہے.....“

اتنے میں ایک تانگہ آیا۔ ایک صاحب نے اتر کر کسی کا پتہ دریافت کیا معلوم ہوا  
جیسے مرحوم کے ارد گرد تصورات کی جو نیم شفاف اور نیم غیر شفاف بھول بھلیاں قائم  
ہو گئی تھی وہ ایک بیک فضا میں تحلیل ہو گئی۔ پوئے بھائی آگے جا دیساں کوئی نہیں  
میں نے کمالات زیادہ آئی۔ اب گھر جاؤں گا۔ کہا جاؤ۔

عرصہ کی بات ہو ایک دن خود بخود فرمانے لگے ہم اس مغالطہ میں مبتلا  
تھے کہ ہم جیسا خطی شاید ہی کیس ملے۔ لیکن ایک ہم سے بھی زیادہ بگڑے  
دل نکلے صبح کمرہ میں سو رہا تھا صاحب معمول رضائی اوڑھ کر اور کمرہ بند کمرے۔  
ایک صاحب نشست کے کمرہ میں آئے دیکھا کوئی نہیں ہے سونے کے کمرہ  
پر اکڑ دستک دی اور سلام علیک کچھ اس انداز و اجہ سے کیا کہ میں چونک پڑا۔  
رہنائی کے اندر ہی سے جواب دیا وعلیکم السلام انھوں نے فرمایا نماز

شریف، میں نے کہا، ابھی آنکھ لگی تھی، فرمایا مولانا میں نے آپ کے ملا خطہ کے لئے ایک کتاب بھیجی تھی، جواب میں عرض کیا گیا، بھیجی ہوگی، اتنی ہی رہتی ہیں، بولے آپ نے مطالعہ کیا، میں نے کہا یہ کیا ضرور ہے کہ مطالعہ کی جائے۔ یہ سب کچھ وہ کھڑے کھڑے فرما رہے تھے اور میں رضائی کے اندر ہی تھی جواب دے رہا تھا۔ اتنے میں آواز آئی، مولانا آپ کی دو باتوں کی شہرت سنی تھی ایک اخلاق کی اور دوسرے علم کی۔ اخلاق کا تو حال معلوم ہو گیا، علم کی بھی کسی دن تصدیق ہو جائے گی۔ سلام علیکم! میں گڑبڑا کر چارپائی سے اٹھا اور جلدی جلدی نشست کے کمرہ میں آیا لیکن وہ جا چکے تھے۔

مردم دوست بنانے اور معالج انتخاب کرنے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ ایک دفعہ کہنے لگے سنجی علاج سے فائدہ نہیں ہوتا معالج سے فائدہ ہوتا ہو جب تک معالج کرنا نہ ہو مریض کو کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک دفعہ سنایا۔ کہنے لگے ایک دفعہ خیال آیا کہ دلی کے کسی صلیبی حکیم سے رجوع کروں۔ چنانچہ بہت غور و فکر اور تلاش کے بعد ایک ایسے طبیب کا انتخاب کیا گیا جو طب میں دلی کے بعض مشہور اطباء کے استاد رہ چکے تھے ان کا نام بھی بتایا تھا لیکن یہاں مصلحتاً نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اتنی پچاسی سال کا سن بڑے متدین، پرہیزگار اور صاحب کمال تھے۔ ان کے خیالات بھی عجیب و غریب تھے، یہ ناممکن تھا کہ ان کے مطب میں کوئی شخص ترک ٹوپی اور کھڑا

جائے۔ ایک صاحب سوٹ پہن کر آگئے تھے تو ایسے بچھے کہ مارا مطلب پر وزیر ہونے لگا اور جب تک وہ چلے نہیں گئے چین سے نہیں بیٹھے۔ کہتے تھے دیکھو تو جہاں میں نماز پڑھتا ہوں وہاں یہ مسخرہ ترکی ٹوٹی اور کوٹ پتلون پہنکر چلا آیا۔ مرحوم نے ان سے ملاقات کی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ مرحوم نے اپنی شکایات بیان کیں۔ بھوک نہیں لگتی، قبض رہتا ہے، تبخیر کی شکایت ہے، خیالات منتشر اور پراگندہ رہتے ہیں، اختلاج کی تکلیف ہوتی ہے، کبھی کبھی خفقا کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ زیند بہت کم آتی ہے وغیرہ۔ حکیم صاحب سب کچھ بہت غور سے سنتے رہے اور اکثر سراسر طور پر ہلا دیتے تھے گویا ہر بات دلنشیں ہوتی جا رہی ہے۔ جب مرحوم کتنا ختم کر چکے تو حکیم صاحب بولے ٹھیک ہے۔ بالکل بجا فرمایا، ایسا ہی ہوتا ہے ایسا ہونا چاہئے مرحوم نے فرمایا کوئی نسخہ تجویز فرما دیجئے تو بولے جی نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شرفا کا مرض ہے، شش بفیوں کو ایسی شکایات لاحق ہوتی ہیں، مرحوم نے فرمایا آخر کوئی علاج، بولے بالکل نہیں کوئی مرض ہو تو علاج کیا جائے اشرف انھیں شکایات میں مبتلا ہوتے ہیں !

میری طالب علمی کا ابتدائی زمانہ تھا کالج کھلنے والا تھا، مرحوم وطن سے تشریف لا رہے تھے میں الہ آباد میں ملا مرحوم سکندھلاس میں مسعود کر رہے تھے اور مرحوم کے بڑے بھائی جوعصہ سے اپنا دامغانی توازن منہو چکے



تھے ہمراہ تھے، اسٹیشن پر مجھے دیکھا، بولے آ جاؤ۔ کھانا کھایا جائے گا۔ میں نے کہا میں سکند کلاس میں کیسے بیٹھوں کہنے لگے کھانا کھانے کے لئے ہر کلاس برابر ہے۔ کوئی پوچھے گا تو میں سمجھ لوں گا۔ تم تو آ ہی جاؤ۔ ایک انگریز بھی اسی ڈبے میں تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر میں نے کہا اور جو یہ فورٹ ولیم بیٹھا ہوا ہے۔ کہنے لگے گھبراؤ نہیں یا رہے آ جاؤ میں اندر آ گیا۔ انگریز نے مولانا کی طرف اس طرح دیکھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مولانا کی تجویز سے اتفاق کرتا ہے۔ مولانا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ہاں بیٹھے رہو۔ سب ٹھیک ہے۔ سمجھے نا کھانا کھائے گا۔ اس نے اشارہ سے ظاہر کیا گویا وہ ہر طرح راضی و خوشنود ہے۔ کھانے سے البتہ معذور ہے۔

نصف ڈبے میں مولانا کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ہر طرح کے کپس بٹر ٹوکریاں، ڈبے گٹھریاں، صراحی، پانڈان، کھانے کا سامان کیا گیا ایک پوری برتن کھانوں سے بھر گئی۔ ہر طرح کے کھانے ہر ذائقہ کے حلوائے، منٹھائیاں ان کے علاوہ کہنے لگے یہ کھاؤ ہماری طرف کی خاص چیز ہے، نیب کی کونپل اور کلیاں قیمہ کے ساتھ پکائی گئی تھیں۔ بڑی تیز مرچیں ڈالی گئی تھیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کی گئی تھی۔ دوسرا سالن خالص ہری مرچ کا تھا، پراٹھے، خستہ پنجاہاں اور پوریاں علیحدہ تھیں۔ بڑے فرے سے کھانا کھایا گیا۔ کہنے لگے خوب کھاؤ والدہ نے پکایا ہے یہ نعمت کہاں ملتی ہے

سمجھتے ہو، ماں نے پکا پایا ہے۔ ہاں۔ وہ یہ خیال کر کر کے کیسی خوش ہوتی ہوگی کہ سلیمان کھا رہا ہے، کھلا رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے۔

مرحوم کے بڑے بھائی جو سفرِ حضر میں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے کھانی میں شریک ہوئے، کیسی ہی پر تکلف دعوت یا مغزِ ہماں کیوں نہ ہوئے۔ یہ ہمیشہ شریک رہتے تھے۔ مرحوم ان کو ”بھائی جان“ کہتے تھے، بھائی جان بولتے بالکل نہ تھے، دسترخوان پر یک بیک آجاتے اور جو کچھ جی میں آتا اور جس طرح جی میں آتا کھاتے اور فوراً اٹھ کر چل دیتے، بھائی جان کی طرف دیکھ کر کہتے کیوں بھائی جان ٹھیک ہے نا۔ وہ حسب معمول بالکل جواب نہ دیتے۔ ماں کا نام اور غالباً مرحوم کی جوش اور محبت بھری باتیں سن کر ہلچل بدلتے اور جلدی جلدی ہر چیز میں ہاتھ ڈالتے کچھ نہ بٹولتے اور تھوڑا بہت اٹھا کر منہ میں رکھ لیتے۔

اسی زمانہ میں میری والدہ مرحومہ نے رحلت فرمائی کبھی مرحوم نے ماں کی باتیں کچھ ایسی وارفتگی سے بیان کرنا شروع کی تھیں کہ میری طبیعت بھڑائی مرحوم نے دیکھا اور بغیر کسی ارادہ یا تکلف یا قطع کلام کیے ہوئے، یا نگھانے کی طرف سے توجہ ہٹائے ہوئے کہا، ہاں ہاں وہ تو مجھے معلوم ہی لیکن ہونہ چکا، خیال فرماتے ہو بس ہو چکا، بڑی خوش نصیب تھیں کہ تمہارے سامنے مریں تم ان کے سامنے نہ مرے ان کو یاد رکھو ہمیشہ یاد

رکھو۔ ماں کو کون بھولتا ہے۔ جب تک نہ بھولو گے لڑکپن کی خوشدلی اور وصلہ  
باقی رہے گا۔ یہ لویا پی پو۔ سب کچھ ماں کا دیا ہوا ہے اور ہاں یہ لینا۔ یہ  
آم..... مے باپ نے دیا تھا۔ کتا ہے اس کے باغ کے درخت  
کا پلاہل ہے، جب تک میں نہ چکھ لوں گا کسی اور کو نہ ملے گا۔ اس میں تمہارا  
بھی حق پہنچتا ہے۔ یہ ہمارے بہار کا آم ہے۔

اتنے میں فچھورہ لگیا، کمنے لگے جاؤ، اما وہ پر پھر ملنا چاہئے پی جا سکی۔  
مرحوم ہمیشہ سکند کلاس میں سفر کرتے تھے۔ بڑے سامان و اہتمام  
کے ساتھ۔ سینٹ ہمیشہ ریئر روکر لیتے تھے۔ مرحوم اس زمانہ سے سکند  
کلاس میں سفر کرتے تھے جب سکند کلاس میں سفر کرنا خاص منزلت کی  
بات سمجھی جاتی تھی۔ اس سامان و اہتمام کے ساتھ آج کل میں اچھے  
اچھوں کو بھی فرسٹ کلاس یا سلون میں سفر کرتے نہیں پاتا۔ معلوم ہوا  
تھا کہ کوئی صاحب وقار سفر کر رہا ہے۔ اسٹیشن کی ہر چیز بڑھیا اور تھری  
ہمسفروں کا رکھ رکھاؤ۔ لباس و اطوار میں صفائی اور خوش سلیقگی جس  
غرض سے سفر کرتے تھے صرف اسی کو پورا کر کے واپس آ جاتے تھے ایسا سا  
ہی کبھی ہوا ہو کہ جس خاص غرض سے سفر کیا ہو اس کے علاوہ بھی کچھ اور  
کر کے واپس آئے ہوں۔

شکل سے سال بھر ہوئے ہوں گے۔ رات کا وقت تھا، باہر چوترا

پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے آج تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ یہ تو بتاؤ  
دل میں کبھی کوئی خطرہ بھی گزرتا ہے میں نے کہا میں آپ کے سوال کی عہدیت  
نہ سمجھا۔ خطرہ سے کیا مراد ہے کہنے لگے مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے  
دل میں کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ ہم سے یہ اچھا کام نہ ہو سکا حالانکہ ہم  
ایسا کر سکتے تھے۔ میں نے عرض کیا۔ آپ تو جانتے ہیں میں اپنی زندگی سے  
بہت خوش اور مطمئن رہا ہوں۔ مجھے ہمیشہ ہر وہ نعمت حاصل رہی جس کی  
میں نے خواہش کی لیکن ایک بات البتہ ایسی ہی جو اکثر مجھے کھٹکتی ہے کہنے  
لگے ہاں ہاں وہی بات تو پوچھتا ہوں۔

میں نے کہا آج علی گڑھ آئے ہوئے ۲۳-۲۴ سال ہوئے گھر سے  
پہلے پہل نکلا تھا تو زندگی کچھ اور تھی۔ اب کچھ اور ہے پہلا زمانہ بڑی تنگ حالی  
کا تھا۔ اب خدا کے فضل سے ہر طرح کی کامرانی اور فراوانی حاصل ہو۔ یہ  
بھی اللہ کا کچھ کم احسان نہیں ہے کہ ماں باپ بھائی بہن جو آج سے ۲۳-۲۴  
سال پہلے موجود تھے سوا والدہ مرحومہ کے بقیہ سب بقید حیات ہیں اور میری  
کامرانی سے خوش اور مطمئن۔ لیکن جو بات کھٹکتی ہو وہ یہ کہ علی گڑھ کی زندگی  
یہاں کی ہماہمی بیوی بچے دوست احباب، وطن سے دوری اور اس قسم  
کی بہت سی باتوں نے مجھے اس موقع ہی نہ دیا کہ ان لوگوں کا دھیان  
بھی آتا جو میری دولت، راحت اور عزت میں شریک ہونے کا حق رکھتے

تھے، مجھ پر بہتوں کے حقوق ہیں ان حقوق کو میں تھوڑا بہت ادا کرنے کی  
 کوشش بھی کرتا ہوں لیکن دل گواہی دیتا ہے کہ جو کرنا چاہئے اس سے  
 انماض کرتا ہوں یہ نہیں اپنے اپنے گھر جا چکی ہیں، بھائی بھی برسرِ کار ہیں  
 ان میں کوئی آرام سے بسر کر رہا ہے اور کوئی تنگی ترشی سے۔ والد صاحب  
 گھر پر ہیں۔ کبھی کبھی وطن جاتا ہوں تو سب کو دیکھ بھال آتا ہوں۔ والد  
 صاحب آرام سے ہیں اور باوجود اس پیرانہ سالی کے وہ اب بھی دوسروں  
 سے خدمت لینے کے بجائے دوسروں ہی کو آرام پہنچاتے ہیں۔ میں جاتا  
 ہوں تو پھولے نہیں سماتے اور اب بھی میرا جی خوش کرنے کے لئے اور  
 اپنا بھی، وہی باتیں کرتے ہیں جو بچپن میں میرے لئے روارکتے تھے میں  
 تھوڑے ہی عرصہ کے لئے ان سے ملنے جاتا ہوں اور جلد ہی واپس آجاتا  
 ہوں، مجھے معلوم ہے اگر میں ان سے ملنے کے لئے زرا دیر اور ٹھہر جاؤں تو  
 ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوگی لیکن یہ جانتے ہیں کہ میں بمبئی بچوں  
 میں جلد سے جلد واپس آجانا زیادہ عزیز رکھتا ہوں اس لئے اشیاءِ گنہگار  
 بھی کبھی اس کا اظہار نہیں کرتے کہ میں تھوڑے عرصہ کے لئے اور ٹھہر جاؤں  
 میں تھوڑی دیر کے لئے رُک گیا اور بولا، مولانا آپ کے سوال نے دل  
 کے مدتوں کے اٹے ہوئے سوتے کھول دیئے، ایسا تو نہیں کہ آپ اکتانے لگے  
 ہوں، علی گڑھ میں اس قسم کے خیالات شاذ و نادر ہی آتے ہیں۔ آپ نے

نہیں معلوم دل کے کون سے تار کو جنبش دے دی کہ اس وقت طبیعت بڑا بڑا ہو گئی۔ اس گفتگو کو ہمیں کیوں نہ ختم کر دوں۔ مرحوم پر اس وقت ایک استغراقی کیفیت طاری تھی۔ چونکہ پڑے، کہا نہیں نہیں کہے چلو۔ اب ختم کیے بغیر نہ رکنا۔

میں نے کہنا شروع کیا، سارا قصہ میں اس اندیشہ سے نہیں دہرانا چاہتا کہ خود ناظرین کو اُن سے کوئی دیکھی نہیں ہو سکتی لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک وہ باتیں معلوم نہ ہوں مرحوم کے اُس عمل ذہنی کا اندازہ نہیں ہو سکتا جو میں یہاں بتانا چاہتا تھا۔ میری داستان کا خلاصہ یہ تھا کہ میری علی گڑھ کی زندگی اُس زندگی سے بالکل مختلف ہو گئی تھی جو میں اپنے والدین اور اعزاء کے ساتھ وطن میں بسر کر چکا تھا۔ اس زندگی میں جہاں میں گزشتہ آرام و مصائب کو بھول چکا تھا وہاں اُن ذمہ داریوں کو بھی بڑے حد تک نظر انداز کر گیا جو اپنے بزرگوں اور عزیزوں کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتی تھیں۔ وہ مجھ پر اب بھی جان چھڑکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ میری رنج و راحت سے جتنا وہ لول یا مسرور ہوتے ہیں اتنا ان کے رنج و راحت سے لول یا محزون نہیں ہوتا۔ فراغت کی زندگی کی یہ محرومی اکثر میرے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔

میں بزرگوں اور عزیزوں کے رنج و راحت میں شریک ہونا چاہتا

ہوں میں چاہتا ہوں کہ ان کے مسرت کے پیالہ کو جو بہت ہی اقل ہی اپنی  
توجہ سے لبریز کر دوں لیکن مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ نفس جیلے تراشتا ہے  
تو میں اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہوں۔

مرحوم گردن جھکائے ساری داستان سنا کے، میں خاموش ہو گیا  
تو یک سخت چونک سے پڑے، فرمایا، بڑی بات کہہ ڈالی اللہ بخشنے والا  
خوب کئی ٹھیک کئی میرے دل کی بات کہہ دی۔ اللہ خوش رکھے،  
پھر اٹھ کر ٹہلنے لگے، کمر پر ہاتھ باندھ کر سر نیچا کئے دیر تک ٹہلے، تھوڑی  
تھوڑی دیر بعد کہہ دیتے، ٹھیک کئی بڑے پتے کی بات کئی بڑی مبارک  
بات ہے۔ نئی بات کئی مرحوم کی اس وقت عجیب حالت تھی، کبھی یہ معلوم  
ہوتا جیسے عالم جذب طاری ہے کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے بہت مسرور  
مطمئن ہیں۔ دیر تک یہ حالت قائم رہی۔ آخر میں کہا اس وقت جاؤ پھر بھی  
اس پر فصل بحث ہوگی۔

مرحوم کالج کے مضابطوں کے بڑے پابند تھے۔ رات کے وقت کئی  
کچی بارگوں کے دروازے بند ہو جاتے تھے اور آمد و رفت کے لئے صرف  
و کٹوریا گیٹ میں ایک چھوٹا دروازہ کھلا رہتا تھا جس پر دربان مقرر تھا  
اور آنے جانے والوں کے نام و پتے لکھ لیتا۔ آدم جی پیر بھائی منزل  
(دو منزلہ) کے دروازے جس میں مرحوم تمام عمر مقیم رہے مارلسین روڈ

پر کھلتے تھے۔ مرحوم بڑی رات گئے ٹھک بیدار رہتے لیکن یہ ناممکن تھا کہ کوئی طالب علم یا شخص آدم جی پیر بھائی منترل کے دروازے سے سید محمود کو رٹائیں آجاسکے۔ منشی سے عشاء کی نماز پڑھ کر واپس آتے اور کچھ لوگ ساتھ ہوتے تو مرحوم ان کو کبھی اپنی طرف سے باہر نکلنے نہ دیتے ہمیشہ یہ کہہ کر واپس کر دیتے کہ وکٹوریہ گیٹ سے باہر جاؤ۔ اس میں طلباء یا غیر طلباء کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ اس پر طلباء یا دوسرے لوگوں سے کبھی کبھی بدفرنگی بھی ہوئی لیکن مرحوم نے اپنے اصول سو بھی انحراف نہیں کیا۔

کم و بیش تیس سال تک دو منترلہ میں مقیم رہے۔ اگر مرحوم علی گڑھ میں موجود ہوتے تو دو منترلہ میں مرحوم کا موجود ہونا بھی یقینی تھا۔ برخلاف دوسرے لوگوں کے یہ ناممکن تھا کہ مرحوم محض تفریحاً یا اخلاقاً گئیں اور ملنے ملائے چلے گئے ہوں ہمیشہ اپنے مستقر پر ملے۔ سو اس کے کہ کہیں شادی یا غمی کی تقریب ہو یا یونیورسٹی کے کام سے وائس چانسلر یا پروفیسر وائس چانسلر نے طلب کیا ہو یا اپنوں میں سے کوئی بہت بیمار ہو بہت کم لوگوں کو شادی معلوم ہو کہ مرحوم نے سو منترلہ یا تھ نہیں دیکھا تھا۔ کہتے تھے ادھر جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ یہ بات میں فی بہت کم لوگوں میں پائی۔



یونیورسٹی میں بڑے بڑے لوگوں کی آمد پر جن جلسے ہوا کرتے تھے مرحوم ان میں سمجھی نہیں سہریک ہوئے۔ اس پر اکثر پیچیدگیاں بھی پڑیں لیکن مرحوم اپنی جگہ سے ذرا اوجھڑا دھرنہ ہوئے کہتے تھے یونیورسٹی میں دولت امارت کا کیا بیج۔ ایسے لوگوں کے لئے ساری دنیا پڑی ہے وہیں یہ ڈھونگ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں علم و فضل دیکھا جاتا ہے۔ کوئی صاحب فضل و کمال آئے تو البتہ!

ایک بار کوئی ٹینگ تھی جس میں گفتگو تیز ہونی شروع ہوئی، ایسے موقع پر مرحوم کب قابو میں رہنے والے تھے۔ بعض لوگوں نے جو قریب ہی بیٹھے تھے مولانا کو دیا یا کہ خاموش ہو جانا ہی مصلحت ہے۔ مرحوم نے چمک کر کہا۔ خاموش کیسے ہو جاؤں واسطے کو ایڈرس نہیں دیا جا رہا ہوں علم و ایمان کے مسائل ہیں۔ خیال فرماتے ہونا۔ علم و ایمان کی آزمائش ہے نیا زمندی یا اطاعت شعاری کی نمائش نہیں ہے۔ ٹینگ سے واپس آنے کے بعد مجھ سے فرمایا اور کیوں جی یہ تم بھیگی پٹی بنے کیسے بیٹھے رہے میں نے کہا مولانا بس تھوڑی ہی سی کسر باقی تھی ورنہ آپ دیکھتے کہ بھیگی پٹی گریہ عاجز بن جاتی۔ بڑے زور سے ہنسنے پھر فرمایا ”لیکن رہتے پٹی ہی“۔

مرحوم مذہبی معتقدات میں بڑا غلو رکھتے تھے اور انہماک کا موقع آتا تو کھلم کھلا ان کا اعلان بھی کر دیا کرتے تھے۔ بانیہ مختلف ان خیال لوگوں سے

بھی بقول ان کے کھانا کھل ہوا تھا۔ خالقِ عالمین کے مقربین میں محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مولانا ابوبکر صاحب، محمد مقتدی خاں شروانی، نواب صدر یار جنگ بہادر، سید زین الدین صاحب تھے۔ باہر والوں میں سے مولوی ابوالحسن صاحب، سید بہاء الدین صاحب کو یہ امتیاز حاصل تھا۔ مولانا ابوبکر صاحب کے بڑے درج تھے ایک دن کہنے لگے جب یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہو رہا تھا تو میں کچھ تذبذب میں تھا۔ تم تو جانتے ہو ان کا مسلک میرے مسلک سے جدا ہے، میں سمجھتا تھا شاید میرا ان کا نباہ نہ ہو سکے لیکن یہ آدمی تو بے نظیر نکلا۔ مولانا ابوبکر صاحب کو منہ کی تکلیف ہوئی اور عدالت کسی قدر تشویش ناک صورت اختیار کرنے لگی تو ایک دن بڑی بے قراری سے فرمایا، اللہ شفا ہے یونیورسٹی کیا دور دورا ایسا آدمی نہ ملے گا۔ علوم پر بڑی اچھی نظر ہے۔ بڑی گہری نظر ہے، حاضر علم ہے بڑی متوازن شخصیت ہے۔ نہ رعب کھاتا ہے نہ رعب ڈالتا ہے، یہ بات مولویوں میں ناپید ہے پھر یاروں کا یا رہے۔ کہتے کہتے ایسا معلوم ہوا جیسے طبیعت میں گدگدی پیدا ہو گئی کہنے لگے عجیب آدمی ہیں۔ کوئی کام ہو کسی کا کام ہو کسی سے ہو بجا اپنی رومال کندھے پر ڈالا اور ڈنڈا اٹھال کر گھر سے نکل پڑے۔ یہ شخص فرض کو فرض سمجھ کر نہیں پورا کرتا بلکہ اس کے ادا کرنے میں لطف اٹھاتا ہے۔ آج کل دیکھو کس کرب میں مبتلا ہیں لیکن

نہ معمولات میں کوئی فرق آیا ہے اور نہ بات چیت کرنے میں کوئی تردد یا  
اضمحلال کتنوں کی ان کے دم سے پرورش ہے۔ ہاتھ کھلا دل غنی  
برائے دار آدمی ہے!

ڈاکٹر صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے  
کہا چلئے مولانا سے مل آئیں۔ ہم جیسے پیچھے مرحوم استنجا کرنے جا رہے تھے  
میں پہلے کمرہ میں داخل ہوا کہنے لگے ”اچوہ یہ سواری بادبہاری کہاں  
سے آئی“ اچھا بیٹھ جاؤ استنجا کروں۔ فوراً ہی ڈاکٹر صاحب کمرہ میں داخل ہوئے  
دیکھتے ہی مسرت سے چہرہ جگمگا اٹھا۔ ایک خاص انداز ترنم سے بولے اہو  
ہو ہو ”ڈاکٹر تم کہاں“؟ اہلاً وسہلاً ڈاکٹر صاحب نے فرمایا عرصہ سے حاضر  
نہیں ہوا تھا۔ آج ارادہ کر لیا کہ ضرور جاؤں گا، بولے جزاک اللہ جزاک  
اللہ۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولے خدا خوش رکھے انھیں خوب لائے  
خوب لائے۔ لوٹا نہیں پر رکھ دیا۔ میں نے کہا استنجا سے فارغ ہوا آئیے۔  
کہنے لگے نہیں اب نہیں۔ ڈاکٹر سے بات ہوگی۔ اب سب کام ملتوی یہ  
کہہ کر تخت پر جا کر دوزانو بیٹھ گئے۔ تخت پر مولانا کم بیٹھے تھے۔ کوئی ہوتا  
یا آتا مرحوم معمولاً اپنی آفس کرسی پر گول میز کے سامنے دونوں پاؤں اٹھائے  
بیٹھے رہتے یا بیٹھے۔ تخت پر دوزانو بیٹھنا خاص ہی خاص مواقع پر ہوتا۔  
جب طبیعت نہایت شگفتہ ہوتی تو تخت پر آ جاتے اور دوزانو بیٹھتے۔ یہ

انہیں کا فقرہ ہے کہ اب اجلاس تخت پر ہوگا۔ اس کے معنی تھے کہ لطف  
 صحبت میں کسی قسم کا غلغلہ نہ دیا جائے گا اور صحبت پورے طور پر  
 گرم ہوگی۔ چار تیار کی گئی۔ شفاف سنہری مائل چائے، نمبر کی خوشبو سے  
 معطر، تھوڑی شکر ملی ہوئی بغیر دودھ کے خوشنما بلوریں فجان میں اس  
 درمیان میں کوئی دوسرے درجہ کا آدمی آجاتا تو اسے فوراً رخصت  
 کر دیتے اور فوراً کہہ دیتے اس وقت جاؤ پھر کبھی آنا۔  
 اُس دن بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی بڑے لطف کی باتیں بڑے  
 محبت کی باتیں اور بڑے پتے کی باتیں۔

میں نے بہت کم لوگوں کو مرحوم جیسی بڑے لطف باتیں کرتے سنا ہے۔  
 بر محل لطائف یا فقروں کی کمی نہ تھی۔ لطیف خواہ وہ کیسے ہی ہوں۔  
 زبان کہتے تھے۔ ان کی زبان پر بعض غیر ثقہ فقرے بھی بڑے مزہ کے  
 معلوم ہوتے تھے۔ میرا ان کا بڑے عرصہ تک ساتھ رہا ہے میں نے ان  
 کو شاید ہی کبھی ایک ہی لطیفہ یا فقرہ دہراتے سنا ہے ایسوں سے بھی  
 واقف ہوں جو بڑے لسان اور طرار سمجھے جاتے ہیں لیکن دو چار صحبتوں  
 کے بعد اکثر یہی معلوم ہوا کہ فقرے اور لطیفے رٹے ہوئے ہیں جو موقع  
 بے موقع دہرائے جاتے ہیں، بر محل اور اچھوتا فقرہ چست کرنا ہر ایک  
 کا کام نہیں ہے۔ مرحوم کو اس میں خاص درک تھا۔

میں نے انھیں جلال کے عالم میں بھی پایا ہے۔ علم و مذہب پر گفتگو کرتے کرتے اکثر جلال میں آجاتے لیکن اس جلالت کی شان ہی کچھ اور ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ علم یا مذہب کے بل پر یا ان کے ناموس کی حفاظت میں آمادہ جہاد ہیں۔ بکریا یا بختہ کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ لیکن جب بے تحلف دوستوں کے حلقہ میں ہوتے تو ان کی باتوں میں شگفتگی، رنگینی، وزیابی ہوتی، مرحوم یاد آتے ہیں تو میرے ذہن میں ”عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوز دروں“

کا نقشہ بھی پھر جاتا ہے۔

مرحوم کے بڑے بھائی کا انتقال مرحوم کی رحلت سے کوئی دو سال پہلے علی گڑھ میں ہوا۔ بڑے بھائی انھیں مرحوم ”بھائی جان“ یا بھیا کہتے تھے مدتوں سے جنون میں تھے، بولنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ چپ چاپ ادھر ادھر پھرا کرتے تھے۔ کسی سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کے لئے تکلیف دہ تھے۔ مولانا مرحوم، بڑے بھائی سے اس حال میں جتنی محبت کرتے تھے اور ان کے راحت کی جزئیات پر جیسی ان کی نظر تھی اس کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ رکنہ کلاس میں انھیں ساتھ رکھتے تھے۔ دسترخوان پر معزز سے معزز ہمان کیوں نہ ہوتا بڑے بھائی ضرور بلائے جاتے۔ بڑے بھائی جس طرح جس کھانے کو کھانا چاہتے

کھاتے۔ ان کے لئے سردی گرمی کا لباس بڑی محنت اور تکلف سے بنواتے۔  
 ”بھائی جان“ ہی کے لئے آدم جی پیر بھائی منزل کی شمالی سمت ایک  
 احاطہ بنوادیا تھا جس میں ہر طرح کے پھول کے درخت لگوا دیئے تھے برآمدہ  
 میں پھولوں کے گئے تھے۔

بھائی بیمار ہوئے تو مرحوم سے پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ مریض  
 اپنا حال نہیں بتا سکتا تھا، معدہ کی تکلیف تھی حکیم صاحب معالج تھے۔  
 ان کی مشکل یہ تھی کہ معدہ کو الیشوں سے پاک کرنے کا جو طریقہ مناسب  
 ہو سکتا تھا مثلاً عمل دینا اسے مولانا مرحوم برتنے نہیں دیتے تھے۔ کہتے  
 تھے بھینانے جو بات تمام عمر گوارانہ کی اسے آخر وقت میں کیسے ہونے دو۔  
 معلوم نہیں وہ کس عالم میں ہوں۔ ان کے دل پر کیا گزرے گی۔ بول  
 براز کا امتحان یا ان کے اخراج کا طریقہ یا ان کے متعلقات پر گفتگو کرنا  
 خود مولانا مرحوم بالکل نہیں پسند کرتے تھے۔

بھائی کی بیماری میں مرحوم کا یہ عالم تھا کہ کھانے پینے، پینے اور پھٹنے  
 سوئے بیٹھنے کی کوئی فکر نہ تھی۔ لباس میل، خط بڑھا، اوقات مقررہ میں  
 گر بڑے گفتگو میں ناہمواری کہتے تھے نفس نے اپنے مطالبات چھوڑ دیئے  
 ہیں حکیم صاحب نے نہایت محنت ہوشیاری اور جانفشانی سے علاج

۱۔ حکیم محمد عبداللطیف صاحب لکھنوی وائس پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ۔

کیا۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات، دوائیں آتش جو شربت اور دیگر ضروری  
چیزیں گھر سے تیار کر کے بھیجتے۔ ضروری مشاغل سے فرصت پا کر رمضان  
کے پاس آجاتے ہر طرح کے جتن کئے گئے لیکن ایک پیش نہ گئی اور بھائی  
جان مولانا مرحوم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد ایک دن مرحوم خود بخود فرلے گئے رشید! معلوم ہوتا  
ہو کہ میری خمیر بھی علی گڑھ ہی کی ہے۔ پہلے اکثر خیال آیا کہ اچھے برے دن سبھی  
دیکھ لئے اب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو جاؤں اور وطن جا کر  
بزرگوں کی یاد میں بقیہ زندگی بسر کر دوں۔ علی گڑھ میں زمین بھی مل سکتی  
تھی کبھی یہ خیال آتا تھا کہ میں مکان بنوا لوں اور رہ بسوں، بھیا زندہ تھے  
تو یہ سب خیال آتے تھے وہ چل دئے۔ بہت سی ذمہ داریاں ختم ہو لیں  
تو بعض کمزوریاں بڑھ گئیں۔ اب ٹھکان لی ہے کہ بھیا ہی کے قدموں میں  
جا بسوں۔ خدایدین الدین کا بھلا کرے انھوں نے اپنے قبرستان  
میں تھوڑی سی جگہ دے دی ہے۔ اب کہیں نہ جاؤں گا۔ ہاں ذمہ داری  
ختم ہو جائے تو کمزوری سے مغلوب ہو جانا کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔  
مرحوم کی زندگی کچھ عرصہ سے خراب چلی آئی تھی بڑے بھائی کی وفات  
کے بعد اس میں بہتیں اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ پچھلے رمضان میں بخارا آیا،  
معالج کے اصرار کے باوجود روزے رکھنے سے باز نہ آئے لیکن جب طبیعت

زیادہ نڈھال ہونے لگی تو روزے ترک کر دیئے۔ مرض نے طوالت پکڑی لیکن کچھ عرصہ بعد افاقہ کی صورت پیدا ہوئی۔ میں بہت دنوں سے حاضر نہیں ہوا تھا۔ ایک دن کلج سے واپسی پر وہاں گیا تو سونے کے کمرہ میں ملے۔ دروازہ کئے پاس ہی ایک صوفہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کمزوری ضرور تھی۔ لیکن چہرہ روشن تھا، گفتگو آہستہ آہستہ کرتے تھے لیکن آواز میں خشکی نہ تھی۔ دیر تک بات کرتے رہے جس میں ہراس یا مایوسی کا شائبہ تک نہ تھا۔ کہنے لگے رشید جو کچھ ہوا ہوا جو ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا لیکن یہ تمہارا حکم بڑا بے نظیر آدمی ہے۔ خدا اسے خوش رکھے کیا کوئی عزیز کرے گا جو اس نے کیا۔ ایسے لوگ اب کہاں۔ بڑا سمجھدار آدمی ہے۔ صاحب فن کی حیثیت سے میں نے اسے گھبراتے نہیں دیکھا۔ محبت کی وجہ سے البتہ پریشان ہونے لگتا ہے۔ نوجوان ہے نا۔ عمر گزرنے پر یہ بات جاتی رہے گی۔

مرحوم کی وفات کے بعد ایک دن حکیم صاحب سے گفتگو آئی تو وہ بھی تعجب کرتے تھے کہ ایسے پکے عقیدہ کا مریض انھوں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ کہتے تھے مرحوم کے فراج کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔ ان کا علاج اس وقت تک کوئی کر ہی نہ سکتا تھا جب تک کہ ان کے اعصاب رئیس کی عجیب و غریب ولسا اوقات متضاد و جلد جلد بدلنے والی کیفیات سے پورے طور پر آشنا نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ ادویات تجویز کرنے میں بھی اس کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا



کہ کون سی دوا کس حد تک مفید ہوگی اور کہاں پہنچ کر وہ مرحوم کے فرائض سے بے آہنگ ہو جائے گی۔ جب مرض کی شدت غالب آنے لگتی ہے تو اکثر طبیب کو بھی اشتدادی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ضابطہ دوا اور طریق علاج سے ہٹ کر بعض کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ دواؤں سے اعضا پر کوئی رد عمل نہ ہوتا تھا اور قصورِ راست ہوتا بھی تھا تو نقصان کی طرف ہوتا تھا۔

حکیم صاحب کہتے تھے کہ میں نے یہ محسوس کر کے کہ ممکن ہے مرحوم میرا لحاظ کر کے کچھ نہ کہتے ہوں ایک دن میں نے دبی زبان سے کہا کہ مولانا اب معالج بدل کر دیکھا جائے کیا ہوتا ہے ممکن ہے مرض میری سمجھ میں نہ آتا ہو یا میری تدابیر کارگر نہ ہوتی ہوں حکیم صاحب کہتے تھے مولانا پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی، کہنے لگے حکیم یہ سمجھتے ہو گے کہ مولوی مر گیا تو لوگ کہیں گے کہ حکیم صاحب کے علاج سے مرا۔ خبردار خبردار مت گھبرانا علاج تمہارا ہی رہے گا۔ مارنا جلانا تمہارا کام نہیں ہے یہ تو کوئی اور کرتا ہے۔ تم فکر مت کرو۔ علاج کئے جاؤ۔ بہت ٹھیک علاج کر رہے ہو۔ مجھ سے زیادہ کون جانے گا کہ علاج کیسا ہو رہا ہے۔ علاج قیامت تک نہیں بدلا جائیگا۔

سمجھے نا؟ ہاں! ہر شخص نے حتیٰ کہ مولانا مرحوم کے ایسے دوستوں نے جن کو وہ نہایت

محترم و عزیز رکھتے تھے، اصرار کیا کہ علاج بدل دیا جائے۔ مرحوم نہ مانے اور ہمیشہ یہ کہتے رہے ہم لوگ میرے حکیم کو کیا سمجھتے ہو۔ بڑے معرکہ کا علاج کر رہا ہو۔ میں اپنی جگہ پر بالکل مطمئن ہوں۔ حکیم صاحب فرماتے تھے کہ مولانا نے ایک بار فرمایا تھا کہ حکیم اب کے تو جانیر ہو گیا۔ اب بخار آیا تو پھر نہ اترے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔

بچھلی عید میں مرحوم نے مسجد میں نماز پڑھی۔ کمزور ہو چکے تھے۔ میرا اور بعض دوستوں کا رت سے یہ معمول چلا آتا تھا کہ مسجد سے واپسی پر سب سے پہلے دو منزلہ آتے اور مرحوم سے مل کر اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے گزشتہ عید کے موقع پر پہنچا تو مرحوم ملاقات کے کمرہ میں اجاب و عقیدتمندوں کے ہجوم میں کھڑے تھے۔ اسی وقت مسجد سے واپس آئے تھے۔ ٹھکن سی محسوس کر رہے تھے فرمایا بھائی، معاف کر دو دم لینے کرسی پر بیٹھ گئے اور مصافحہ کرنے لگے۔ میں پہنچا تو اٹھ کر بغل گیر ہوئے۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا اور اپنے لیے چوڑے سرخ ٹھٹھے دار رو مال سے پیشانی سے بار بار پسینہ پونچھتے تھے لیکن چہرہ پر بشارت تھی اور آواز میں کہہ رہے ہیں مرحوم آواز کے لئے اکثر یہ لفظ دکر رہے ہیں استعمال کرتے تھے۔

ماہ صیام آ رہا ہے۔ عید بھی آئے گی۔ اس وقت جبکہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں رمضان کے کتنے نیلے اور عید کی کتنی تقریبیں یاد آ رہی ہیں ترویج

کے بعد مرحوم کے ہاں کی وہ صحبتیں جب چائے کا دور ہوتا تھا مخلصین کا مجمع الطغ کی باتیں مرحوم کی باتوں میں وقت کتنا جلد جلد گزرتا تھا۔ جو کوئی آتا اس پر محبت کا کوئی فقرہ چست کرتے۔ چائے کی پیالی پیش کی جاتی کسی کے حلیہ پر کوئی فقرہ کہہ دیتے کسی کے لباس کی تعریف کر دیتے کسی کی کارگزاری کی داد دیتے کبھی کبھی کسی علمی مسئلہ پر کسی کی رائے لیتے اور مذاق ہی مذاق میں اس کے بعض نازک پہلو اس طور پر بیان کر جاتے گویا وہ با بھی اُس صحبت کی تفریحی گفتگو کا ایک جز تھی۔ عید کی نماز سے واپسی پر حلقہ احباب "گرم ہوتا۔ چائے عطر و پان سے ہر ایک کی تواضع کی جاتی۔ شخص کے مذاق کو مد نظر رکھ کر اس سے پرسش احوال کرتے۔ کالج پائٹیکس پر بھی مجمع میں اظہار خیال نہ کرتے اور نہ کسی کو اس قسم کے مسائل چھیڑنے کی ہمت ہوتی۔

دوسری بار مرحوم علیل ہوئے تو روز بروز حالت گرتی ہی گئی۔ اس دوران میں عرصہ تک میں حاضر نہ ہو سکا۔ دریافت کرنے پر ہمیشہ یہی معلوم ہوا کہ کمزوری بڑھتی جاتی ہے اور مرض قابو میں نہیں آ رہا ہے۔ اس حالت میں مرحوم کو دیکھ نہ سکتا تھا جس شخص کو تندرستی زندگی استقلال و استقامت کا جیتا جاگتا نمونہ دیکھ چکا تھا اسے بے بس و ناتوان دیکھنا میرے بس کا نہ تھا۔ ایک دن مکان پر ایک اہم کام میں مصروف

اور پروانس چانسلر صاحب کے خط کا منتظر تھا کہ نوکرنے اگر خبر دی کہ مولانا صاحب کی طبیعت خراب ہے حکیم صاحب اور دوسرے لوگ وہیں گئے ہوئے ہیں۔ زبان سے بے ساختہ انا اللہ نکلا۔ گریٹر تاراد و منزله پہنچا۔ ہجوم دیکھ کھول بیٹھ گیا۔ سکرہ میں سب لوگ جمع تھے۔ کئی ڈاکٹر بھی بلائے گئے تھے۔ مشورہ ہو رہا تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے غفلت طاری رہنے لگی ہے کبھی کبھی ہوش میں آ جاتے ہیں۔ علاج بدلنے پر اب بھی تیار نہیں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جو کچھ ہونے والا ہے اسے اب کوئی ٹال نہیں سکتا۔ علاج بدلنا نہ بدلنا دونوں برابر ہیں۔ دل البتہ نہیں بانتا۔ شاید ڈاکٹری علاج سے نقشہ بدل جائے۔ نواب صدر یار خٹک بہادر جو مرحوم کے سب سے مقرب و محترم تھے اندر تشریف لے گئے میری اب بھی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا۔ مرحوم کی حالت غیر ہو چکی تھی لیکن پہلے حکیم صاحب سے پوچھا حکیم تم بھی چاہتے ہو کہ علاج بدل دیا جائے۔ حکیم صاحب نے کہا ہاں۔ فرمایا تو پھر جو چاہو کرو۔

یہ ہو چکا تو دل کڑا کر کے میں بھی حاضر ہوا۔ کسی نے میرا نام لے کر باواز بلند کہا کہ فلاں آیا ہوا ہے۔ مرحوم نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ مرحوم نے مجھے دیکھ کر پہچانا ہو۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے پھر یاد دلایا کہ فلاں آیا ہوا ہے۔ نہایت خفیت آواز میں آیا

”اب آئے ہو..... بڑی دیر کر دی“ اس کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔ ذری ہی دیر میں پھر ہوشیار ہوئے فرمایا یہ ”کیا ہو رہا ہے“ یہی تین فقرے تھے جو میں نے سنے۔

کچھ دیر تک میں کمرہ میں مرحوم کی چارپائی سے لگا بیٹھا رہا۔ موت کا تصور کبھی کبھی ماضی کے دھندلے نقوش کو بہت زیادہ نمایاں کر دیتا ہے۔ اتنا نمایاں گویا ان میں از سر نو زندگی ڈال دی گئی ہے۔ مجھے کچھ ازلہ زمانہ ایک ایک کر کے یاد آنے لگا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں اٹھارہ سال قبل میں رہ چکا تھا۔ مرحوم نے ایک دن اس زمانہ میں مجھ سے فرمایا کہ اس عمارت کے دو حصوں میں ہم دو تم آباد ہیں میرے لئے موجودہ ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔ بھائی جان کو بھی تکلیف ہے۔ اگر یہ حصہ بھی مل جاتا تو ہم لوگوں کے لئے بڑی آسانی ہو جاتی۔ میں اسٹاف میز آگیا تھا اس لئے بڑی آسانی سے مجھے اور کمرے مل گئے اور میں ڈار سے رخصت ہو گیا۔ مجھے وہ زمانہ یاد آ رہا تھا۔ اس کمرہ میں معلوم نہیں اور کیوں وہ باتیں یاد آنے لگیں جن سے زندگی کے بعض بڑے دکھ نشیب و فراز وابستہ تھے۔ اپنے ہی نہیں مرحوم کے بھی۔ اُن کے دُجر سے کیا حاصل۔ یہ وہ کمرہ تھا جس میں مرحوم بڑے شوق سے آئے۔ اس میں ان کے شوق کی تمام چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہیں وہ بیٹھا

اور مخلص اجباب سے بڑے شوق سے ملتے تھے۔ اور — میں سے وہ آج  
 ہر شوق سے رخصت ہو رہے تھے۔ وہ شخص جو دوسروں کے لئے سہارا تھا  
 آج ہر سہارے سے بے نیاز ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں جن میں زندگی غلوں  
 اور سرداری کی چمک تھی بے نور ہونے لگی تھیں جس سرچشمہ سے میں اور  
 کتنے اور تقدیر اور برپا شرت حاصل کیا کرتے تھے وہ خشک ہو رہا تھا ہمیشہ  
 کے لئے خشک !

میں بیٹھا رہا۔ مرحوم کی حالت دیکھ کر طبیعت بے اختیار ہونے لگی۔ جی  
 چاہتا کاش مولانا ایک سخت تندرست ہو کر بیٹھ جاتے اور کہتے ”خوب آئے  
 بیٹھو گپ ہوگی۔ کہد و اب بڑا ہو گیا۔ ناچے گا نہیں۔ پان کھاؤ۔ ایک مجھے بھی  
 دینا“ میری وہ حالت تھی جب آدمی دعائیں مانگتا۔ شاید مانگ بھی نہیں  
 سکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ دعا مانگنا عبث ہے۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ہر چیز  
 دگرگوں ہو جائے۔ ناممکن ممکن ہو جائے۔ یہ خواہش دعا مانگنے سے بھی  
 زیادہ عبث ہے لیکن معلوم نہیں کیوں یہ بات جتنی ناممکن ہے اتنی ہی فطری  
 بھی معلوم ہوتی ہے !

میں چلا آیا اور پھر نہ گیا۔ دو دن بعد مولانا سلیمان اشرف صاحب  
 کا انتقال ہو گیا۔

اور اللہ نے اپنے بہادر کو ہم میں سے اٹھالیا !

جنازہ کے ہجوم میں قبرستان پہنچا۔ قبرستان سے متصل  
میدان میں نماز کے لئے جنازہ رکھ دیا گیا اور ان لوگوں کا انتظار کیا جانے  
لگا جو دفن میں شریک ہونے کے لئے دوڑتے بھاگتے چلے آ رہے تھے۔  
نماز پڑھانے کا سب سے زیادہ حق نواب صدر یار جنگ بہادر کو پہنچتا تھا  
اچانک علالت کے سبب سے موصوف تشریف نہ لاسکے۔ مولانا ابوبکر صاحب  
منہ کے زخم رسنے کے سبب سے معذور تھے چنانچہ مولانا شفیع صاحب نے  
نماز جنازہ پڑھائی۔ اس وقت جبکہ نماز جنازہ کا مسئلہ زیر غور تھا مجھے مرحوم  
کی ایک بات یاد آئی۔ عرصہ ہوا مولانا نے مجھ سے ایک بار فرمایا تھا۔  
دیکھو دنیات کے پرچہ میں جو نماز جنازہ کا سوال میں ہمیشہ رکھ دیتا ہوں  
اس کا سبب جانتے ہو میں نے لا علمی ظاہر کی تو فرمایا کہ ہر مسلمان جو اپنے  
مرحوم بھائی کے ساتھ آخری سلوک کر سکتا ہے وہ نماز جنازہ ہے۔ میں نے  
لوگوں کا تو مجھے یہ تو اطمینان ہے گا کہ میرا ہی کوئی عزیز طالب علم میری نماز  
جنازہ پڑھائے گا!

اس وقت جبکہ یہ نہیں طے ہو رہا تھا کہ نماز جنازہ کون پڑھائے مجھے  
مرحوم کی بات بے اختیار یاد آئی اور یہی جی چاہا کہ مرحوم ہی کا کوئی شاگرد  
نماز پڑھائے۔ کاش میں ہی پڑھا سکتا۔ لیکن توفیق ہوئی تو بس اتنی کہ جس  
جگہ مجھے نماز جنازہ پڑھانی چاہئے تھی۔ وہیں تعزیت کا رزلویشن پڑھ کر گھر واپس  
آگیا اور نماز جنازہ بہادر تعزیت کا رزلویشن پڑھا۔ ارے گدا!

## مولانا ابوبکر صاحب (مرحوم)

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر  
 کیا دولے نے موت پائی ہے !  
 مولانا الحاج ابوبکر محمد شہید فاروقی جو نپوری ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی  
 علی گڑھ اپنے پیدا کرنے والے سے جلائے نہ دعائیں مقبول ہوئیں نہ دوائیں  
 کارگر۔ وقت نکلتا رہا لیکن انجام وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ دلی تمنا تھی کہ  
 یہ نہ ہوتا لیکن مشیت الہی کو کون سمجھ یا ٹال سکا ہے !  
 اے وہ زندانی، تقدیر (انسان) جسے بانی تقدیر بھی کہتے ہیں !

مولانا میرے ہم وطن تھے۔ کیا بتاؤں کہ میں ان کو کب سے جانتا ہوں  
 ان کی شخصی خوبیوں کو بحیثیت خود دیکھا۔ ان کے بزرگوں کی برگزیدگی اپنے  
 بزرگوں سے سنی۔ کتابوں میں پڑھی اور ولوں میں پائی، ابتدائی باتیں  
 تو حافظہ کے دور دراز افاق پر کسی پرندہ کی موہوم پرواز کی مانند گم ہوتی  
 جا رہی ہیں اب ان کو کون واپس بلائے کس دل سے بلائے اور بلائے  
 سے حاصل ہی کیا !



علی گڑھ نے کسی کام کا نہ رکھا، اُس نے اپنا بنا لیا، یہ بڑا ہی سخت گیر اور شکنجہ محبوب ہے۔ نہیں چاہتا کہ اُس کے ادنیٰ مطالبات سے گریز کیا جائے یا اس کے سو کسی اور سے التفات کیا جائے اس نے مجھے میری نظر میں محترم کر دیا، اس قید سے مخلصی کہاں۔ بہت سی باتوں میں اب نہ علی گڑھ سے بہتر و برتر مجھے مقام نظر آتا ہے اور نہ علی گڑھ والوں سے بہتر و برتر لوگ۔ جب کسی اچھے آدمی سے ملاقات ہوتی ہے تو معاد دل میں سوال پیدا ہوتا ہے یہ علی گڑھ کا ہے یا نہیں؟ نہیں ہوتا تو افسوس ہوتا ہے کہ ایسا اچھا آدمی علی گڑھ کے فیضان سے محروم رہا اور جب معلوم ہوتا ہے کہ میں کا ہے تو فخر سے گردن اونچی اور مسرت سے دل لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ دل کا ایک راز تھا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

پندرہ سولہ سال ہوئے یونیورسٹی میں ناظم دینیات کی جگہ خالی ہوئی میرے ذہن میں یک نکتہ یہ بات آئی کہ مولنا میاں آجائیں تو خوب ہو۔ حسن اتفاق سے جلد ہی جانے کا موقع ملا۔ مولنا سے استعراج کیا۔ سب تک یاد ہو مولنا ایک کھڑی چار پائی پر پٹے ہوئے بہتر پر سر رکھے لیٹے عالم شوق میں کچھ اشعار پڑھ رہے تھے میں نے پنیکر سلام کیا تو وہ علیکم السلام اس لطف سے کہا جس سے محسوس ہوا کہ میرے آنے کی مولنا کو بڑی خوشی

ہوئی اور سلام کا یہ جواب ایسا طویل اور پُر غلو ص صحبت کی دعوت ہے۔  
 ہر ملنے والے سے خواہ وہ اجنبی اور نووارد ہی کیوں نہ ہو مولنا کا یہی  
 انداز پذیرائی تھا۔ خود اٹھ بیٹھے اور مجھے بھی اپنی ہی چار پائی پر بٹھا لیا۔  
 اپنے لمبے رومال کو جو پاس ہی رکھا تھا اس طور پر گھسیٹے اٹھایا کہ جس جگہ  
 میں بیٹھنے والا تھا اس کو جھاڑ پونچھ دینا مقصود تھا۔ قدیم زمانہ کے بزرگوں  
 کا یہ خاص انداز تھا۔ بولے کو علی گڑھ کا کیا حال ہے۔ کب آئے؟ میں نے  
 کہا مولنا ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔ بولے کو ضرور کو، وہ ان کا  
 مستعدی اور ولولہ سے اس طور پر ہمہ تن تیار ہو جانا جسے ضرورت ہو تو  
 کام پورا کرنے کے لئے وہیں سے میرے ساتھ ہو جائیں۔

میں نے کہا علی گڑھ میں ”ناظم دینیات“ کی جگہ خالی ہے۔ آپ  
 قبول کر لیتے تو بڑا اچھا ہوتا۔ کہنے کی یوں ہمت نہیں پڑتی کہ آپ کا  
 سیاسی مسلک اور ہے، علی گڑھ کا اور فرمایا، مسلک کی تو کوئی بات نہیں  
 مسلک تو ایک ہی ہو اور وہ مسلک ہے اسلام کا میں نے کہا یہ تو میں  
 سمجھتا ہوں لیکن یہ کون سمجھائے اور سمجھے کہ کون سا مسلک کیا ہو۔ بولے  
 سمجھنے سمجھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کرنے دھرنے سے ہوتا ہی صحیح اور سچا  
 راستہ دریافت کرنے اور اس پر چلنے میں تو ممکن ہے وقت ہو لیکن صحیح  
 اور سچا آدمی بڑی آسانی سے پہچانا جاتا ہے۔ تمہارا علی گڑھ ”مصالح“

کا شکر ہے۔ مصلحت اندیشی ابھی چیز ہے لیکن مصلحت پرستی تنزل کی جڑ ہے کچھ دیر تک اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ مولانا تو پھر بسم اللہ علی گڑھ تشریف لے چلے۔ وہاں آپ کی بڑی ضرورت ہی ہوئے، کیا مضائقہ، لیکن میں دوڑ دھوپ کرنے اور سفارش بہم پہنچانے کے چکر میں نہ پڑوں گا۔ میں نے کہا یہ آپ مجھ پر چھوڑیے میں تو صرف آپ کا عندیہ لینا چاہتا تھا۔

میں چلنے لگا تو بولے دیکھو اس سلسلہ میں کوئی بات ایسی نہ کرنا جو تمہارے یا میرے شایانِ شان نہ ہو۔ میرا شمار کچھ بہت کھاتے پیتے لوگوں میں نہیں ہے لیکن روپیہ پیسہ کے علاوہ اللہ کا دیا اور برزگوں کا سپرد کیا ہوا اور بہت کچھ موجود ہے مجھے نہ نوکری کی خواہش ہے اور نہ ضرورت۔ تم کہتے ہو کہ علی گڑھ چلوں میں بھی سوچتا ہوں کہ کچھ دن یہ مشغول بھی رہے تو کیا ہرج۔ علی گڑھ والوں کو قریب سے دیکھنے سمجھنے کا موقع ملے گا۔ پھر تم ہو، ایوب ہیں، وغیرہ وغیرہ

یا دہنیں آتا کون لوگ اور موجود تھے کس نے کہا، اور کیوں مولانا آپ کی اور مولانا سلیمان اشرف صاحب کی کیسی سمجھ گئی۔ مولانا نے فرمایا، بھائی ٹھیک کہتے ہو، یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ میرے اُن کے بعض امور میں اختلافات ضرور ہیں لیکن وہ جون پور میں تو

رہے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے واقف بھی تو ہیں۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ علی گڑھ جا کر وہ کیا سے کیا ہو گئے۔ لیکن اتنا ضرور یقین ہے کہ وہ میری مخالفت نہ کریں گے!

میں علی گڑھ واپس آ گیا۔ سب سے پہلے مولنا سلیمان اشرف صاحب مرحوم سے ملا دیکھتے ہی بولے، 'کو پانکٹ میں کچھ ہے؟ اس سے مرحوم کا مطلب یہ ہوتا، کوئی لطیفہ ذہن میں ہے؟ دھرا دھرا دھر کی باتوں کے بعد میں نے کہا، 'ایک بات آپ سے منوانے کے لئے حاضر ہوا ہوں بولے، 'شاہاباش اچھے گھر نیو تہ دیا ہے، ارے سلیمان اشرف سے بات منوانا، تم کو کسی نے بہکایا ہو گا۔ میں نے کہا مولانا بہکایا کسی نے نہیں۔ یہ آپ یقین فرمائے، بولے تو پھر ٹھیک ہے، خود ہی بکنے ہو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے کہا مولنا یہ بکنے بہکانے پر آپ اتنا زور کیوں لے رہے ہیں۔ میں خود بہکایا بہکایا گیا لیکن آیا تو آپ ہی کے پاس۔ یہ بھی کوئی بکنے میں بکنا ہوا؟ مرحوم بڑے زور سے ہنسنے پھر فرمایا اچھا اچھا کو، بارش بابا ہم بازی۔ ہاں ہم سمجھا، کو کیا کہتے ہو۔ میں نے ناظم دینیات کے تقرر کے سلسلہ میں مولنا ابو بکر صاحب کا نام لیا اور اس کے بعد ہی اُن کے محاسن زبان پر لانا چاہتا تھا کہ بولے، 'اچھا، اچھا، ذرا چپ نہ ہو جاؤ۔ مولوی ابو بکر سے میں واقف ہوں، میرے اُن کے مسلک میں

فرق ہی، تم کو یہ باتیں معلوم نہیں، لیکن وہ آدمی اونچے گھرانے کا ہے،  
پھر غور میں پڑ گئے تھوڑی دیر تک ہاتھ پیچھے باندھے ہلتے اور لنگناتے  
رہی اس کے بعد بولے اچھا جاؤ۔ مولوی حبیب الرحمن خاں سے مشورہ  
کر کے بتاؤں گا۔

کچھ ہی دن بعد مولانا بالاتفاق ناظم دینیات مقرر ہو گئے، پندرہ سال  
تک مولانا نے جس لطف و بہرہ دی، وسیع النظری، انتظامی قابلیت  
اور عالمانہ رکھ رکھاؤ سے اس منصب کے فرائض انجام دیئے اس کی  
نظیر علی گڑھ کے محکمہ دینیات کی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گزری۔ گو  
یہ ان کے فرائض منصبی میں نہ تھا لیکن پانچویں وقت کی نماز پابندی کے  
ساتھ خواہ کوئی اور کیسا ہی موسم ہو، یونیورسٹی میں تعطیل ہو یا نہ ہو مسجد  
میں پڑھائی اس میں حتی الوسع کبھی ناغہ نہیں کیا ”دینیات کی لائبریری“  
از سرنوبت کی۔ دینیات کے نصاب پر نظر ثانی کی مسجد اور متعلقہ عمارات  
کو ستھرا اور دیکھنے کے لائق بنائے رکھا، جنے دارالاقامہ یونیورسٹی اور سکول  
سے متعلق تھے ان میں نماز پڑھنے پڑھانے کا باضابطہ انتظام کیا۔ یونیورسٹی  
میں مذہبی و اخلاقی فضا پیدا کرنے میں انتہائی خلوص و تدبیر سے کام لیا۔  
مذہبی و اخلاقی فضا ایک غیر متعین تصور ہے مرحوم کا نظریہ اس بارہ

۴  
 میں سب سے علیحدہ لیکن پورے طور پر متعین اور واضح تھا۔ وہ کہا کرتے  
 تھے کہ علی گڑھ ان معنوں میں کوئی دینی یا مذہبی ادارہ نہیں ہے جن معنوں  
 میں دہلوی، سہارن پور وغیرہ کے مذہبی یا دینی ادارے ہیں۔ یہ ایک  
 دنیوی تعلیم گاہ ہے جس میں طلباء کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے جو ضروریات  
 زمانہ میں ان کی کفیل ہو اور دنیوی مطالبات پورا کرنے میں ان کی مدد  
 کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مسلمانوں کا بھی ادارہ ہے اس لئے اس میں  
 صرف اتنا لحاظ رکھنا چاہئے کہ ہمارے طلباء اسلام کے اعلیٰ تصورات معاد  
 و معاشرت سے آشنا رہیں اور علوم جدیدہ یا معاشرت حاضرہ کی زد  
 میں آکر اسلامی شعائر و اسلامی روایات سے بیگانہ نہ ہو جائیں۔ یونیورسٹی  
 میں عبادت سے زیادہ اعتقاد کو صحیح رکھنے کا التزام رکھنا چاہئے اس  
 کے بعد منزل یہ ہے کہ اعتقاد عمل کی کسوٹی پر کھڑا ثابت ہو جس اعتقاد پر  
 عمل کا جامہ ٹھیک نہ آئے وہ اعتقاد نہیں دینی قیام یا گمراہی ہے مسلمانوں  
 کا عمل عبادت ہے عبادت عمل نہیں یہاں یہ چیز ہمارے آپ کے عمل  
 سے پیدا ہو سکتی ہے قواعد کے شکنجوں یا تعزیرات کے خوف سے نہیں۔  
 مسلمان بنے رہو مسلمان بنتے رہیں گے۔ قواعد قانون بدلتے رہیں گے۔

مرحوم کا سیاسی مسلک جمعیتہ العلماء کا تھا اور جہاں تک

شعائر اسلامیہ کا تعلق تھا وہ بدعات شرعیہ کے سخت مخالف تھے۔ فاتحہ پیرپستی اور اس قسم کی دوسری باتوں کے بالکل قائل نہ تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے وہ بڑے حامی تھے۔ تمام عمر ان کا لباس گری کارٹھ کارہا۔ سر پر عمامہ اور پاؤں میں پنجابی جوتہ۔ صرف سخت سردیوں میں کوئی معمولی سا موزہ پہن لیتے۔

مجھے یاد آتا ہے ایک صحبت میں جمعیتہ العلماء اور کانگریس کے سیاسی مسلک پر گفتگو چھڑی ہوئی تھی مرحوم چوڑہ پراپنی عجا اور عمامہ سر کے نیچے رکھے ہوئے لیٹے تھے۔ حاضرین میں سے کسی شخص نے جو جمعیتہ العلماء اور کانگریس دونوں سے بیزار تھا جمعیتہ کے سیاسی مسلک پر نکتہ چینی کی مولنا صاحب نے کہنے لگے بھائی انصاف کرو۔ اور حد و دے متجاوز نہ ہو۔ علماء میں ہر اعیب سہی لیکن انہوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوشش میں کچھ کم ہتہ نہیں لیا ہے آج کل لوگ زیادہ تر تقریر کرتے ہیں تجریم پیش کر دیتے ہیں یا ستیا گرہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی ایسے زمانہ میں جب حکومت کی مخالفت کرنا کچھ بہت زیادہ نقصان دہ یا تکلیف دہ نہیں ہے۔ علماء نے تو اس وقت سے ”آزادی کا علم بلند کر رکھا ہے جب ہندوستان میں آزادی کے نام سے بھی کوئی آشنا نہ تھا۔ اور آزادی و بغاوت ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ کانگریس

کے نام تک سے کوئی واقف نہ تھا۔ علماء پچھانسی پر چڑھائے گئے۔ اُن کے گھر ڈھائے گئے۔ اُن کو کالایا نہ بھیجا گیا۔ ان کے عورتوں بچوں پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے۔ تم لوگ تو ہندوستان کی تاریخ سے واقف ہو۔ کچھ بیچارے علماء کی بھی تاریخ پڑھی ہوتی۔ آج ہندو آزادی کے معاملہ میں اپنے آپ کو سب سے اونچا اور سب سے آگے سمجھتے ہیں۔ لیکن کوئی ہندو آزادی کے معاملہ میں علماء سے انکھ برابر نہیں کر سکتا۔

مولانا نے اس سلسلہ میں ہندوستان کی تاریخ جہاد پر بڑی مسلسل اور دلنشین تقریر کی۔ علماء کے بہت سے تباہ شدہ خاندانوں کا حال سنایا۔ جہاد پر جو نظمیں جب کبھی لکھی گئی تھیں اور ضبط ہوئیں اُن سب کو سنایا۔ جہاد کی تحریک جس طور پر شروع ہوئی، جو لوگ شریک ہوئے اور ان کا جو کچھ انجام ہوا سب سنائے، پھر بولے دوستو! میرا نہ ماننا تمہارے مصلح یا تمہاری کمزوری اپنی اپنی جگہ میرا ہے جیسی ہو مجھے اُن سے کوئی سروکار نہیں لیکن ایسا تو نہ کرو کہ جن لوگوں نے ہندوستان اور اسلام کی آزادی میں مصلح کو ٹھکرا دیا ان کو تم ٹھکراؤ۔ زندگی کے لطف اٹھاتے ہو خوب اٹھاؤ۔ خدا مہارک کرے اور برکت دے لڑیسی بات منہ سے نہ نکالو جس سے کبھی تم کو ائمہ و اسلاف کی روحوں



کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے!

مولانا کی اس تقریر سے حاضرین پر اس سی پگڑی لیکن اس کے بعد ہی مولانا نے گفتگو کا رخ اس طور پر بدل دیا کہ بات آئی گئی ہوئی اور سب لوگ سنتے بولتے رخصت ہوئے۔ مرحوم نے یہ تقریر کچھ یوں ہی کہیں کر دی تھی بلکہ اس کی تہ میں مرحوم کے خاندان کی بعض روایات بھی ہیں۔

مولانا کے دادا مولانا سخاوت علی فاروقی محمدی صاحب تھے۔  
 مہدوح شاہ عبدالحی صاحب دہلوی اور امیر المجاہدین مولانا شاہ محمد علی  
 شہید شیرہ جتہ اللہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ کے شاگرد تھے اور  
 اور امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید بریلوی کے خلیفہ۔ ان شہیدین  
 سعیدین کے فیض صحبت سے مولانا سخاوت علی رحمۃ اللہ علیہ میں مجاہدانہ  
 سرگرمیاں پیدا ہو گئی تھیں چنانچہ ۱۲۵۷ھ میں یہ مرد مجاہد ہندوستان  
 کو دارالحرب سمجھ کر مکہ معظمہ کو ہجرت کر گیا۔ مولانا سخاوت علی مرحوم کا قائم  
 کیا ہوا مدرسہ قرآنہ اب بھی جون پور میں قائم ہے جس کی ترقی و ترقی  
 بتاریخ مولانا ابوبکر صاحب مرحوم کے چچا مولانا محمد حنیف صاحب مرحوم  
 اور ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی اور مرحوم کے والد ماجد مشہور عالم  
 باعمل حضرت مولانا ابوالخیر محمدی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوئی جن کے  
 بعد مولانا مرحوم اس مدرسہ کے تہتم و ناظم ہوئے۔ مولانا سخاوت علی مرحوم

نے اپنے عہد میں جیسے جیسے نازل معرقت پر دین کی خدمت کی اور ان کے فیض  
صحبت سے جیسے جیسے علمائے دین پیدا ہوئے وہ یورپ کے نواح میں کچھ  
کچھ کی زبان پر ہو۔

جس صحبت کا اوپر ذکر آیا ہے اس میں موجود تھا اور پورے طور پر محسوس  
کر رہا تھا کہ مولانا کو کچھ فرما رہی ہیں اس میں اس حرارت کا بڑا دخل ہے جو مولانا  
کو براہ راست درانتہ پہنچی تھی۔

مولانا کا بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ہر کام خواہ اپنا ہو یا پرایا بڑی خوشدلی  
اور مستعدی سے انجام دیتے تھے اور کسی کو محسوس بھی نہیں ہونے دیتے تھے  
کہ وہ اپنے یا کسی کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بعضوں کا خاصہ یہ ہے کہ  
وہ اپنا یا دوسرے کا کام کریں گے تو اس کا موقع بے موقع اعلان بھی  
کرتے رہیں گے۔ کبھی مصروفیت سے کبھی ناسازی طبع سے کبھی اپنے نقصان  
سے کبھی کوئی اور کام نہ کرنے کے بہانہ سے۔ پھر کہیں گے تو احسان منوانے  
یا اپنی اہمیت و عظمت جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیں گے۔ اکثر ایسے  
بھی ملیں گے جو ادنیٰ سا کام کریں گے جس کے کرنے کا ان کو کافی معاوضہ  
بھی ملتا ہے لیکن اس کا اعلان و اظہار اس طور پر کریں گے گویا کوئی بہت  
بڑی قربانی کر رہی ہیں یا ان پر بہت بڑا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ مہر حرم  
اس کے بالکل برعکس تھے۔ معمولی سے معمولی کام ہو یا بڑے سے بڑا وہ

کو اس طور پر کرنا شروع کر دیتے جیسے ہم آپ غیر شعوری طور پر سانس لیتے ہیں بغیر کسی قسم کا اعلان کئے اور بغیر کسی معاوضہ کے توقع کے اور ختم کرتے تو بس ختم کر دیتے۔ بعد میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔

شعبہ فنون کے ایک طالب علم نے ”اکیڈمک کونسل“ سے ایک بار ایسے مضامین اختیار کرنے کی اجازت چاہی جو مقررہ اوقات تعلیمی میں غل ہوتے تھے۔ کونسل میں اس مسئلہ کے ہر پہلو پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ارین نہ تو یہ چاہتے تھے کہ مائٹم ٹیبل کے وقتوں میں اضافہ ہوا ورنہ اس طالب علم کی درخواست کو اسی بنا پر مسترد کرنا گوارا کرتے تھے۔ جب کافی بحث ہو چکی تو مولانا نے فرمایا کہ کونسل اجازت دیدے جس مضمون کے تعلیم کی گنجائش نظام اوقات میں نہیں نکلتی وہ مرحوم کے سپرد کر دیا جائے۔ وہ اپنے مقررہ گھنٹوں کے علاوہ اس طالب علم کو پڑھائیں گے چنانچہ اس طالب علم کو مولانا نے دو سال تک مسلسل انتہائی پابندی و انہماک سے اپنے فرصت کے اوقات میں تعلیم دی۔

اپنے عملہ میں مولانا کو بعض بڑے بالائقوں سے بھی سابقہ ہوا لیکن وہ ان سے اس طور پر نباہ کرتے تھے کہ ہر شخص کو حیرت ہوتی تھی۔ مؤذنون اور پیش اماموں کی بڑی خبر گیری کرتے تھے۔ ان سے عزت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ یہاں تک کہ ان سمجھوں کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ مولانا

اُن کے افسر تھے۔ ان کے کاموں میں کبھی کوئی عیب یا نقص نہ نکالا۔ اُن کی فانی وقتوں کو اپنا بنالیتے۔ مولنا کے سپرد جو انتظامات تھے اُن کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ قسم قسم کے مسائل اور طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑتا لیکن میں نے کبھی نہ دیکھا کہ مولنا کسی قسم کے تردد یا دوا دوش میں مبتلا ہوئے ہوں۔ کیٹیاں ہو رہی ہوں کا غدی گھوڑے دوڑائے جا رہی ہوں اور ایک ہنگامہ برپا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مولنا کی مشاؤ خود بخود ہر جگہ پوری ہو رہی ہو۔ اور مولنا کا ہر ماتحت یا ان کے ساتھ کام کرنے والا اپنا ذاتی کام سمجھ کر ہر فرض سلیقہ اور محنت سے ادا کر رہا ہے۔

ایک دن ہم سب سید بشیر الدین صاحب قہتم یونیورسٹی لائبریری کے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے، مولنا بھی اپنے خاص انداز دل آسانی و خود اعتمادی کے ساتھ آئے، سب لوگ تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولنا نے بغیر کسی تکلف یا مصنوعی اخلاق کے کہا ارے میاں بیٹھے بھی رہو کیا باتیں ہو رہی تھیں، اور کیوں بشیر ہمارا ”صاحب“ کہاں ہے دیہ سید محمود حسین صاحب پھر شعبہ انگریزی کی طرف اشارہ تھا، بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں اُنہائے گفتگو میں بشیر صاحب نے کہا کہ لائبریری کے قلمی اور مشرقی نسخوں کو حال ہی میں نیوکلچر زروم سے لائبریری کو منتقل کیا گیا ہو کتابیں بے ترتیب ہو رہی ہیں۔ ان کتابوں کی باقاعدہ فہرست

بن جاتی تو بڑا اچھا ہوتا۔

مولانا نے فوراً فرمایا، فکر کی کوئی بات نہیں ہی یہ بھی کوئی کام ہوا،  
 طیفل احمد سے کہو مجھے یہ ذخیرہ دکھاویں۔ میں فہرست تیار کر دوں گا بشرط  
 نے کہا۔ مولانا بڑا پتہ مار کام ہے آپ کا ہے کو تکلیف کریں، مولانا نے فرمایا  
 بھی ذرا دیکھوں تو سہی، جس کام کو نوجوان پتہ مار کہتے ہیں اسے پورے  
 کو کم سے کم دیکھ لینا چاہیے، غرض مولانا نے کام شروع کر دیا کسی کو  
 کانوں کا خبر نہ ہوئی مدتوں مسلسل ہر روز کئی کئی گھنٹے لائبریری کے ایک  
 گوشہ میں بیٹھے کام کرتے رہے اور بالآخر فہرست مکمل کر دی۔ مولانا نے  
 کبھی اس کا بھول کر بھی ذکر نہ کیا کہ وہ کس کام میں مصروف تھے یہاں تک  
 کہ کام بہم وجہ مکمل ہو گیا اس وقت بھی کسی سے اس کا تذکرہ نہ کیا۔ ایک  
 عرصہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مولانا نے فہرست مکمل کر دی تو میں نے ہنسنے لگا  
 مولانا سے کہا، مولانا یہ آپ خواہ مخواہ کا درد سر کیوں خریدتے رہتے ہیں۔  
 کہنے لگے تم بھی عجیب آدمی ہو۔ یہ بھی کوئی کام ہوا بشرط کو اس کی فکر تھی، میں  
 نے کہا کام بھی اچھا اور فرصت بھی ہے کچھ دن اسی کی سیر رہے۔ اس فہرست  
 کے مرتب کرنے میں مج کو یہ فائدہ ہوا کہ بعض نوادر کے دیکھنے کا مفت میں  
 موقع مل گیا۔ اس ذخیرہ میں بعض ایسی کتابیں دیکھنے کو ملیں جن کو میں سمجھتا  
 تھا کہ ناپید ہیں، کسی کا صرف نام سنا تھا ان کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ کچھ ایسی

بھی ملیں کہ اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آگیا!

اسی طرح دینیات کی لائبریری کو بھی مرحوم نے خود اپنے ہاتھ سے از سر نو ترتیب دیا۔ کتابوں کے انتخاب میں بڑی توجہ اور محنت سے کام لیتے تھے۔ علوم اسلامیہ پر جو کتابیں بیرون ہندوستان شائع ہوئیں مولانا کی ان پر خاص نظر ہوتی، ہمیشہ اس فکر میں رہتے کہ کون سی کتاب کہاں شائع ہوئی۔ اکثر پوچھتے رہتے کہ کس یورپین مستشرق نے اسلامی ادب، شاعری یا اس قبیل کی کسی اور موضوع پر تصنیفات شائع کیں۔ ان کے علاوہ مرحوم کو ان کتابوں سے خاص دلچسپی ہوتی جو مذہبی مباحث پر اردو میں شائع ہوئیں۔

اکثر کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی زبانِ قج اردو ہوتی جا رہی ہو، کیونکہ براہِ راست عربی فارسی سے استفادہ کرنے والے اب صرف وہ لوگ رہ گئے ہیں جو تحقیقاتِ علمیہ کا کام کرتے ہیں ورنہ عام طور پر اب ساری مذہبی معلومات اردو ہی کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ مولانا کی وسعتِ نظر کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ان تمام اردو کتابوں کو دینیات کی لائبریری میں جگہ دیتے تھے جو فلسفہ مذہب، اخلاقیات یا اس قسم کے دوسرے مباحث پر یورپین زبانوں سے اردو میں منتقل ہوئی تھیں۔ فرماتے تھے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں یونانی مکتب کے

ترجمہ سے اسلامی تصورات میں جو انقلاب پیدا ہوا تھا۔ اس سے کہیں وہ  
رس نتائج موجودہ عہد میں پیش آنے والے ہیں کیونکہ فلسفہ کی ترقی سائنس  
کے انکشافات مطبوعات کی اشاعت ملنے ملانے کی سہولتیں عوام و خواص  
دونوں کے ذہن و افکار کو بڑی سرعت اور شدت سے متاثر کر رہی ہیں۔  
اس لئے ان مطبوعات پر نظر رکھنا بڑا ضروری ہے۔

یونیورسٹی کا قبرستان آج سے دس بارہ سال پہلے بے آب و گیاہ بالکل  
ویران پڑا ہوا تھا۔ نہ کوئی سایہ دار درخت نہ وہاں پہنچے کا ڈھنگ کا کوئی  
راستہ نہ نماز جنازہ پڑھنے کی کوئی ستھری معقول جگہ نہ محافظ قبرستان کے  
رہنے سنے کا کوئی انتظام نہ میت کے لئے جانے کے لئے کوئی تابوت۔ اسی  
طور بریونیورسٹی کی مسجد میں کوئی وضو خانہ نہ تھا۔ لوگ حوض کے گرد بیٹھ کر  
وضو کرتے تھے۔ ناک تھوک سے پانی کو پاک و محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہ  
تھی میت کو غسل دینے اور کفن کرنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ مولانا نے نہایت  
فاموشی اور مستعدی کے ساتھ رفتہ رفتہ ان سب کا معقول انتظام کر دیا۔

گورستان کا اب یہ عالم ہے کہ شاید اس سے زیادہ سبز و سایہ دار  
جگہ یونیورسٹی میں کوئی اور نہیں ہے۔ صاف پختہ سڑک بن گئی ہے۔ محافظ  
گورستان مع تمام ضروری سامان کے مکمل گھنٹہ وہیں موجود رہتا ہے۔ نماز جنازہ  
کی جگہ متعین ہے اور صفیں بنی ہوئی ہیں، اس کا بھی انتظام ہے کہ دفعتاً کوئی

موقع آجائے اور معقول انتظام جلد اور بروقت نہ ہو سکے تو تکفین و تدفین کا پورا سامان موجود رہے مسجد میں نہایت ہی سہجہ اور خوبصورت وضو خانہ ایک روشن اور محفوظ پرآمدہ میں بنا دیا گیا ہے غسل میت اور تجہیز و تکفین کے لئے مسجد ہی سے طے لیکن الگ تھلگ ایک جگہ مخصوص کر دی گئی ہے۔ یہ انتظامات جتنے ضروری تھے اتنا ہی ان کی طرف ذہن کم منتقل ہوتا تھا لیکن مولانا کو ان کا پورا احساس تھا اور انھوں نے بعض دشواریوں کا نہایت خاموشی سے مقابلہ کر کے ان سب کا مناسب انتظام کر دیا۔

ایک بار یونیورسٹی میں اس کا بڑا چرچا تھا کہ لڑکے کثرت سے سینما دیکھنے جایا کرتے ہیں۔ بورڈنگ ہاؤس سے یا ہر شہر کے اندر رات کے وقت نوجوان طلبہ کا ایسے موقع اور مجمع میں موجود ہونا جن کو کسی طرح قابل اطمینان نہیں لیا جاسکتا، بڑا ہی اس سے ان کے خصائل و اخلاق پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہوا اور حکام یونیورسٹی کے انتظامات میں بھی بڑی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے یہ بہتر ہو گا کہ خود یونیورسٹی کے احاطہ میں سینما ہال کھولنے کی اجازت دینی چاہئے جس پر یونیورسٹی کے مقرر کردہ قیود عائد ہوں۔

دوسرے لوگ یہ کہتے تھے کہ سینما قطعاً حزب اخلاق ہی اس کے علاوہ خود یونیورسٹی میں اس کا انتظام ہونے دینا بڑی غلط فہمیوں کا باعث ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی میں ”ڈرامیٹک سوسائٹی“ پر بھی اعتراضات



کئے جا رہے تھے کہ یہ چیز اسلامی درسگاہ میں نہ ہونی چاہئے۔  
 ایک دن اثنائے گفتگو میں میں نے پوچھا، مولانا اس سینما اور ڈراما  
 سوسائٹی کے بارہ میں مذہبی نقطہ نظر کیا ہے۔ مرحوم نے فرمایا آخر مذہبی  
 نقطہ نظر کے پیچھے کیوں پڑتے ہو۔ معلوم ہوتا ہوں کہ لوگ یہ سمجھتے ہو کہ مولوی سوا  
 مذہبی نقطہ نظر کے فحشی اور نقطہ نظر کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا اور نہ خود  
 اپنی کوئی رائے رکھتا ہے۔ سمجھے یہ تو بتاؤ مذہبی نقطہ نظر معلوم کرنے کی تم  
 کو اتنی فکر کیوں ہے۔ اس نقطہ نظر پر عمل کر دو گے ہندوستان میں بجا  
 موجود اس پر عمل بھی کیا جاسکتا ہے؟ آخر اس پر کیوں نہیں رضی ہو جاتے  
 کہ مذہبی نقطہ نظر کے پیچھے پڑے بغیر بھی معقول پسندی اور حسن تدبیر کو دخل دیا  
 جاسکتا ہے؟

میں نے عرض کیا مولانا بات تو ٹھیک ہی لیکن میں ذرا کثرتِ ذہن و صلح  
 پسند واقع ہوا ہوں۔ معقول پسندی سے بڑی ذمہ داریاں پیدا ہو جاتی  
 ہیں ان سے کون نیٹے۔ مذہبی نقطہ نظر میں یہ آسانی ہے کہ جب جی میں کیا  
 خود جامہ سے باہر ہو گئے اور جب جی چاہا کسی بھلے مانس کی پگڑی اٹھال  
 دی۔ مولانا اپنے خاص انداز میں بغیر آواز کی ہنسی خوب خوب ہنستے پھر  
 اپنے رومال سے چہرہ پونچھتے اور رومال کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولے  
 دیکھو سلام ایک مجموعہ ہے مخصوص مقدمات اور مکمل اعمال کا۔ اس کے

ہر جزو کو کل میں دیکھنا چاہئے نہ یہ کہ کل کو نظر انداز کر کے جزو پر کٹ دے۔  
 جہاں اسلام کا مکمل، متشکل و مؤثر نظام نافذ نہ ہو وہاں ہر مسئلہ یا ہر تحریک  
 کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھنا بیکار اور اس کو بروئے کار لانے کی کوشش  
 مضری۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر اس پر عمل کیا  
 جائے۔ یہ بحث بڑی طویل ہے، کسی مستقل و معقول صحبت میں اس پر مفصل  
 گفتگو ہوگی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لو کہ جب کسی ناگزیر خرابی یا قباحیت  
 کا انداد ناممکن ہو تو انداد کی نہیں بلکہ اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے۔  
 اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ ڈرامے میں سوانگ بھرنا، گانا، ناچنا اور  
 مصنوعی حرکات یا باتیں کرنا مردوں یا مخصوص مسلمانوں کو زیر نہیں دیتیں۔  
 درزش، تفریح، تعلیم، کارکردگی یا اظہار گمال کی اور بہت سی معقول  
 صورتیں بھی تو ہیں آخر ڈراما ہی کو سب کچھ کیوں سمجھ لیا جائے، اچھے ڈرامے  
 لکھو اور اپنی فکر کی زیبائی و رسائی کا ثبوت دو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ اُسے  
 کرنے بھی لگو۔ فنون لطیفہ کو جو معنی بالعموم پہنائے جاتے ہیں اسلام نے اس  
 کو گوارا نہیں کیا ہے، لیکن فنون لطیفہ کی تعبیر میں مسلمان کسی سے پیچھے نہیں  
 رہے ہیں، اسلام طبیعت کی اُچھ کو نہیں روکتا البتہ اس کی نامعقول تعبیر  
 و تشکیس کا احتساب کرتا ہے مسلمانوں کا جمالیاتی تصور کسی سے کم نہیں۔  
 انسانی اعمال و افکار کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کرو تو تم کو معلوم ہو گا کہ میں

جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بے سرو پا نہیں ہے۔  
 علی گڑھ کے طلباء اور اساتذہ کو علی گڑھ اس لئے عزیز ہے کہ اس میں  
 ہر ذوق کی تسکین و تفریح کا سامان میلا ہوتا ہے۔ جو شخص جس قماش کا ہوگا  
 اس کو اسی قسم کی مکمل سوسائٹی میسر آجائے گی۔ علی گڑھ کی ہر دلعزیزی کا  
 یہی راز ہے ورنہ مقامی اعتبار سے علی گڑھ میں کوئی جاذبیت نہیں ہے۔ دوسرے  
 بڑے شہروں کے برخلاف یہاں نہ اعلیٰ درجہ کی دکانیں ہیں نہ منظر فطر  
 نہ تفریح گاہیں۔ یہاں کا کوئی شخص محض تفریح کی خاطر کبھی شہر نہیں جاتا  
 اور نہ کسی کے لئے یونیورسٹی کی حدود سے باہر دستگی کا کوئی سامان ہے۔  
 ہر شخص کو اپنے ہی مخصوص حلقہ میں دھبی کا سارا سامان میسر آ جاتا ہے۔  
 پڑھنا لکھنا، کھانا پینا، شوخی شہارت، کھیل کود، رندی ویاہراتی،  
 غرض یونیورسٹی کی مکمل زندگی میں جن اسباب یا مواقع کی ضرورت ہوتی  
 ہے وہ سب یہاں ملتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ والے جب کبھی اور  
 جہاں کہیں ایک دوسرے سے ملتے ہیں فوراً بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ ان  
 کو تصنع یا تکلف کی نہ ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ اس قسم کی طرز عمل پر  
 قادر ہو سکتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ فریقین ایک دوسرے کی اچھائی بڑے  
 سے واقف اور علی گڑھ کی روایات سے آشنا ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ  
 والے کبھی جہلی کی حیثیت سے نہیں مل سکتے۔

مرحوم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اتفاق سے بھی کسی صحبت میں پہنچ جاتے تو حاضرین میں سے کسی کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ کوئی اجنبی محل صحبت ہوا ہو چہ جائیکہ وہ مولوی ہو جس کے بارہ میں کہا جاتا ہو کہ اس کی چول کسی خانہ میں ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ یونیورسٹی میں ہر طرح کے لوگ اور ہر طرح کی سوسائٹیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ مخصوص حلقوں کے مخصوص طور طریقے ہوں گے۔ کوئی پھکڑ ہے کوئی سنجیدہ، کسی کو سیاسی مسئلے سے کبھی ہرگز کسی کو مذہبی باتوں سے تسکین ہوتی ہے۔ زندگی کو کوئی کسی زاویہ سے دیکھتا ہو کوئی کسی زاویہ سے۔ کوئی کچھ ہے اور کوئی کچھ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ مرحوم یونیورسٹی کے ناظم و نیات تھے جس پر منصب کے اعتبار سے خاص خاص باتیں عائد ہوتی تھیں اور انہیں پابندیوں کے اعتبار سے اس کے کردار گفتار متعین ہوتے تھے۔ بایں ہمہ یہ عجیب بات تھی کہ مولانا کی غیر متوقع آمد پر بھی لوگ خوش اور نشاط ہو جاتے تھے۔ گفتگو کی روانی اور تسلسل میں کوئی فرق نہ آتا اور لوگ آرزو کرتے کہ مولانا بھی ان کی گفتگو میں شریک ہوں۔

مرحوم کی سیرت و شخصیت کا کمال یہ تھا کہ کبھی کسی حالت میں نہ اپنے حدود سے خود متجاوز ہوتے تھے۔ مرحوم کو خدا نے ایسا متوازن دل و باغ دیا تھا اور ان کی شخصیت اتنی دلاویز تھی کہ ان کو اپنے منصب کی آڑ پر کٹنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور نہ انہوں نے اپنے طور طریقوں سے

کبھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ ناظم دینیات یا عالم دین تھے۔  
 ممکن ہے میرے محض اتنے سے بیان کے بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا  
 ہو جائیں اس لئے میں اس کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔  
 فرعن کیجئے کہ کسی مذہبی یا اخلاقی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہو مولنا بھی  
 کوئی آیت یا حدیث نہ پڑھیں گے اور نہ ائمہ و اکابر کے اقوال پیش کریں گے۔  
 وہ بالکل ایک معمولی انسان کی طرح بحث میں حصہ لیں گے اور اپنا نقطہ نظر  
 اس طور پر پیش کریں گے کہ آپ کو اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی ہمت ہوتی رہے گی اور  
 بحث میں آپ کی کبھی پڑھتی جائے گی۔ چنانچہ آپ یہاں تک محسوس کرنے لگیں گے کہ اس  
 سے بہتر کوئی اور موقع اس مسئلہ کے سلجھانے کا نہیں ہے۔

اس قسم کے اکثر مواقع پیش آتے رہتے تھے میں مولنا کی خدمت میں  
 ایک حد تک بے باک تھا اور میری ان باتوں سے مولنا مجھے اور زیادہ  
 عزیز رکھتے تھے ایک بار ایک طویل ”علمی مذاکرہ“ کے بعد میں نے مولنا سے  
 عرض کیا مولنا بات تو آپ ٹھیک کہتے تھے لیکن یہ ساری باتیں بدیہ گوئی  
 و بدیہ آفرینی کے سلسلہ میں تھیں یا اللہ اور رسول کے کلام سے بھی ان  
 کی سند ملتی ہے۔ مولنا اپنی ذہن اور لہجہ میں آنکھوں سے میری طرف دیکھتے  
 ہوئے وہی اپنی مخصوص ہنسی سننے جس میں آواز بالکل نہیں نکلتی تھی لیکن  
 ہنسی کے زور سے سارا جسم جھٹکے کھائے لگتا تھا پھر فرمایا تمہارے سوالات

بھی خوب ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ رسول کے بارہ میں  
آج کوئی فیصلہ کن رائے قائم کرنے والے ہو۔

میں نے عرض کیا مولنا فیصلہ کن، نہیں فیصلہ ہی کیسے اس لئے  
کہ میں فیصلہ تو اکشر کر لیا کرتا ہوں البتہ اس میں ایک بڑی کمزوری یہ  
رہ جاتی ہے کہ فیصلہ تو میں کرتا ہوں لیکن کن اللہ میاں نے اپنے ہاتھ میں  
رکھا ہے۔ مولنا اس فقرہ سے بہت محفوظ ہوئے پھر فرمایا، میں جو کچھ کہتا تھا جس  
کی تصدیق ”کلام الہی“ اور ”حدیث نبوی“ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مرحوم نے  
آیات قرآنی سنائیں احادیث کا حوالہ دیا۔ غرض ہر بات پورے طور پر  
منفعہ کر دی۔

مرحوم کا یہ خاص و طیرہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ چھڑتا تو جب تک ان سے  
خاص طور پر رجوع نہ کیا جاتا وہ خواہ مخواہ مباحثہ میں شریک نہ ہوتے۔  
برخلاف بعض لوگوں کے جن کی عام عادت یہ ہے کہ ایسے مواقع پر وہ جو  
کچھ جانتے ہیں اُسے بے تکان بتانا شروع کر دیں گے اور یہ کوشش  
کریں گے کہ لوگ ان کے فکر و نظر کے قائل ہو جائیں۔ چنانچہ اس وقت تک  
نہ چپ ہوں گے جب تک ان کا مبلغ علم ختم نہ ہو جائے یا لوگ حفاظت خود  
اختیاری میں بھاگ نہ کھڑے ہوں!

لیکن جب کوئی بات مولنا سے رجوع کی جاتی تو وہ نہایت خوشی،

نہایت اطمینان اور نہایت اعتماد کے ساتھ گفتگو کرتے اور علوم و احکام دینیہ کے تمام نکات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتے۔ بعض مسائل ایسے ہوتے جن پر ائمہ کو اختلاف ہوتا اُسے بھی بڑی صفائی و صداقت کے ساتھ واضح کر دیتے مروجہ علوم دینیہ پر برا عبور تھا۔ کتابوں کے حوالے اور اکابر کے اقوال بڑی دیانت اور بڑے وثوق سے پیش کرتے۔ اس وقت مجھے یہ حیرت ہوتی کہ یہی مولانا جواب تک ہم سب کے ساتھ خوش گپتی میں مصروف تھے ایک "تبصرہ عالم" کے فرائض کس خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ مروجہ کو عام طور پر گفتگو کرتے یا رہتے ستے دیکھ کر کسی کو مشکل یہ لگتا ہوتا کہ مروجہ کا علم کتنا حاضر کتنا وسیع اور کتنا گہرا ہے۔ ہم سب بھی آخر تک بڑھنے ہی کا شغف رکھتے ہیں، ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو "علوم جدیدہ" سے پورے طور پر آشنا ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو دونوں علوم پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ علوم دینیہ سے پورے طور پر آگاہ نہ ہونے کے باوجود ہم اس امر کا تو پتہ لگا ہی سکتے ہیں کہ کس بحث میں کس کا کون سا پہلو کمزور ہو۔

میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ مولانا مذہبی نقطہ نظر اس انداز سے پیش کر رہے ہیں گویا وہ خالص مذہبی نقطہ نظر نہ تھا بلکہ اُن کے مد نظر ہمارا ہی اصل بحث تھا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے مولانا ہمیں لوگوں میں ایک تھے اور ہمارے ہی علوم سے بحث کر رہے ہیں۔ وہ بحث میں ایسی مثالیں پیش کرتے جو موجود

دو دریں مسائل ہمہ نہیں بلکہ مسئلہ فیصلے تھے جن پر تجربات جدیدہ کی مہر تہنا د  
لگی ہوئی تھی۔

علوم اسلامیہ میں جو تجربہ مرحوم کو تھا اُس سے قطع نظر دیگر علوم و فنون  
سے بھی مولانا کو بڑی دلچسپی تھی مرحوم کو ریاضی میں بڑا درک تھا۔ میں نے  
ریاضیات جدیدہ کے بعض کالمین کو یہ کہتے سنا کہ مولانا کو ”ریاضی“ اور  
”اقلیدس“ پر بڑا عبور تھا۔ عربی میں ریاضی کا جو سرمایہ ہے اس کا معقول  
حصہ مولانا کی نظر سے گزر چکا تھا۔ فلکیات سے مرحوم کو خاص لگاؤ تھا۔ رات  
میں چوڑے پر لیٹے ہوئے جن جن ستاروں کے عجیب و غریب نام عربی فارسی  
میں آئے ہیں ان سب کو دکھاتے بتاتے۔ ایک دفعہ سمت قبلہ کی بحث انگیزی  
مولانا نے قطب تارہ کا مقام اور مختلف متعلقہ ستاروں کو ایک ایک  
کر کے بتایا۔ ہمہ پیشین کے ماہرین فلکیات نے اپنے حساب کی رو سے جن  
ستاروں کا جو محل یا مقام بتایا تھا اور امتداد زمانہ سے ان میں اب جو تفاوت  
پیدا ہو گیا، ان سب کو بڑے لطف و وضاحت سے بیان کیا۔ اسی سلسلہ میں  
جہزیوں کی مفصل تاریخ اور ان کے اصول ترتیب و تدوین بھی سنائے۔  
ایک دن کہنے لگے اور کیوں جی رشید غالب کے کلام میں ”بناتِ نغمہ“  
کا نام آیا ہے۔ ان کو دیکھا بھی ہے یا نہیں؟ میں نے کہا جی نہیں۔ فرمایا دیکھو  
میں نے کہا اب کیا دیکھوں۔ ان کے دیکھنے کا لطف تو غالب ہی کے زمانہ



میں تھا۔ یونیورسٹی کے عہد میں دیکھ کر کیا کروں گا ہوں گی بھی تو نوین فارم ہی میں ہوں گی۔ ورنہ آپ دعوت دید کیوں دیتے! مولانا بہت لطیف اندوز ہوئے۔

ایک زمانہ میں میرا اردو کا کام ہلکا تھا۔ صرف چند جماعتوں کو اردو کی معمولی کتابیں پڑھانی ہوتیں اس لئے بی اے اور ام اے کا فارسی کا کام بھی سپرد کر دیا گیا تھا۔ ام اے کا تصوف کا پرچہ میرے سپرد تھا اس میں دو کتابیں لوانح جامی اور محمود شبستری کی گلشن رازہ ربا نصوص لاجبی کی شرح گلشن رازہ ایسی تھیں جن میں بعض اوقات مجھے اسلامی فلسفہ، منطق، تصوف و معقولات کے مسائل حمہ سے سابقہ پڑتا تھا۔ میں مرحوم سے رجوع کرتا تو وہ ان کی وضاحت اس خوبی اور اعتماد کے ساتھ کرتے کہ جی خوش ہو جاتا اور ایک خاص طرح کا ذہنی انشراح ہوتا۔

اس کے علاوہ اکثر صحبتوں میں نظیری اور غالب کے کلام پر مباحثہ کیا جاتا۔ اس وقت معلوم ہوتا کہ مولانا کا فارسی شاعری و فارسی ادب کا ذوق کتنا پاکیزہ اور سلجھا ہوا تھا۔ مرحوم کے سامنے اردو کا کوئی اچھا شعر پڑھا جاتا تو اکثر وہ اس سے ملتے جلتے مضمون کا فارسی یا عربی شعر سناتے۔

مرحوم کو صرف عربی فارسی کی ادبیات سے ذوق نہ تھا بلکہ اردو ہائے  
کے بھی ان گنت اشعار یاد تھے اشعار فرے لے لے کر پڑھتے تھے محسن کا  
کوروی کی تقریباً ہر مشہور نظم یاد تھی جس کو ایک خاص ترتیب سے پڑھتے اکثر  
کہا کرتے تھے کہ مذہبی معتقدات کو لکھنوی شاعری میں جس طرح محسن نے  
سمویا اور نباہا ہے وہ کسی اور کے بس کا نہ تھا۔

اسلامی قانون وراثت پر بڑی اچھی اور گہری نظر تھی قانون کے اکثر  
طلباء و فرائض کی تقسیم سمجھنے کے لئے مولانا کے پاس آیا کرتے تھے اور طلباء  
کو پورے طور پر مطمئن کرتے تھے۔

عرصہ کی بات ہو نو نورسٹی میں ایک بنوٹ ماسٹر رکھے گئے تھے۔ بٹے  
شریف اور محبت کرنے والے انسان تھے اور اس فن کے امام وقت تھے۔  
مولانا سلیمان اشرف صاحب مرحوم ان پر بہت مہربان تھے اور اپنے  
دوستوں کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ بھی بنوٹ سیکھیں! کبشہ صاحب نے  
سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک صاحب جن کی نظر سے یہ طور یقیناً  
گذریں گی اپنا ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک دن نماز فجر کے بعد مرحوم  
گھومتے گھامتے ان کے گھر جا پہنچے۔ باتوں باتوں میں پہچنے لگے اور کیوں  
صاحب کچھ بنوٹ کی بھی مشق ہم پہنچائی ہے انہوں نے فرمایا جی ہاں دو چار  
ہاتھ سیکھے تھے لیکن ادھر ناغہ ہوتا رہا اس لئے مشق و صفائی کی نوبت نہ

آئی اور پیچ و پھیرے بھی کچھ بھولنے لگا ہوں۔

مرحوم نے فرمایا اچھا مجھے بتائیے کیا سیکھا تھا چنانچہ انھوں نے دو چار ہاتھ دکھائے مرحوم نے فرمایا اچھا آؤ میں مشق کرا دوں..... حساب کا بیان ہو کہ مولانا مرحوم نے اس سلسلہ میں جو داؤ پیچ بتائے اور جس صفائی سے لکڑی چلائی اور اس کی بندش کی وہ ہر اعتبار سے استادانہ تھی اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بوٹ کے فن میں مرحوم طاق تھے۔

مرحوم کو مردانہ کھیل بہت پسند تھے۔ شکار کے بڑے شائق تھے۔ گولی بھی خاصی چلا لیتے تھے شکار یا رٹوں میں اکثر شریک ہوتے اور شکار میں ”چلائی“ تو وہ ایسی کر لیتے تھے کہ نوجوان دنگ رہ جاتے تھے۔ غلیل چلانے کی بڑی اچھی مشق تھی اس فن کے رموز سے خوب واقف تھے۔ غلیل دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ کہاں کی بنی ہوئی ہے، کس زمانہ کی ہے اور کس کو ٹھی کا بانس ہے۔ بانس کی چھڑی بہت پسند کرتے تھے۔ بانس پچا کا عجیب ملک تھا کسی کے ہاتھ میں اس قسم کی چھڑی یا ڈنڈا لیتے تو اسے ہاتھ میں لے کر اسے بڑے شوق سے دیکھتے بھالتے اور بتاتے کہ بانس کی چھڑی کس طرح بنائی نہ ہاری جاتی ہے۔ اس کی گرہیں کسی بنائی جاتی ہیں، کیسے اس پر رنگ پیدا کیا جاتا ہے۔ کس طرح پختہ کرتے ہیں۔ اور کیا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھنا چاہئے۔

ایک بار ابھڑے ہوئے حروف درملیت کی چھپائی پر گفتگو ہو رہی تھی مرحوم نے فرمایا کہ ان کی طالب علمی کے زمانہ میں اس قسم کی چیز رائج تھی اس وقت مشین تو تھی نہیں لوگ ناخن سے اس طرح کی چیز بناتے تھے اور یہ بھی ایک طرح کا فن تصور کیا جاتا تھا ابھر فرمایا اب مشق تو رہی نہیں لیکن کوشش کرتا ہوں، شاید کچھ ہو جائے۔ اس کے بعد ایک معمولی سے مانڈ کے رزہ کو چنگیوں کی گرفت میں لے کر تلے اوپر کچھ اس طرح ناخن سے لچکے دینے کہ تھوڑی ہی دیر میں چند حروف ابھڑے جو بالکل ایسے معلوم ہوئے تھے جیسے کسی ڈائی سے ابھڑے ہوئے حروف چھاپ دئے گئے ہیں۔ فرمایا جب مشق تھی تو پوری عبارت لکھ لیا کرتا تھا۔

ایک دن بھی ملاقات نہ ہوتی تو پوچھتے کہ کہاں تھے کیسے ہو۔ مسکرا کر محبت و دوستی کے اوج میں شفقت کے انداز سے۔ دوستوں کے بارہ میں لطیف مرحمت کا کوئی جملہ کہتے۔ کوئی ایسی بات ضرور کہتے جس سے مجھے اپنی فریاد شرافت کا احساس ہوتا۔ زمانہ و زندگی کی عارضی یا سلسلہ مکروہات یا سیرت نے بعض داغ دھبے دھل جاتے یا مدھم بڑ جاتے اور محسوس ہونے لگتا کہ رافت وادوا العرمی، خلق و مرحمت دنیا کی بڑی چیزیں اور زندگی کی بڑی بودلیاں ہیں۔

میرا پرانا مکان مرحوم کے مکان سے بالکل قریب تھا۔ ممتاز باؤس کے

پورب میں ایک بڑا میدان ہے۔ اُس میں ہو کر مولانا کا بیج اور مسجد جاتے۔  
 مئی جون کی علی گڑھ کی گرمی میں جب آگ پرستی ہوتی اور گرد و غبار سے فضا  
 تیرہ و تار ہوتی مولانا ظہر کی نماز پڑھانے اس میدان سے گزرتے ایسی پابندی  
 وقت سے جیسے گھڑی چلتی ہے۔ بالکل جیسے کوئی مجاہد میدان جنگ میں  
 جاتا ہو نہایت ہی ادنیٰ قسم کی کھدر کی عبا۔ کھدر کی صدری کھدر ہی کا لمبا کرتہ  
 اور تختوں سے اونچا پا جامہ۔ ایک لمبا سار و مال کا ندھے پر موسم کی شدت  
 ہوتی تو اسی سے گلا اور کان چھپائے ہوئے۔ سر پر عمامہ۔ پاؤں میں مسخ  
 رنگ کا ڈھیل ڈھالانیجائی وضع کا جوتہ۔

مولانا کی عمر غالباً وہ سال کی ہوگی جسم و جسامت کے اعتبار سے ممتاز  
 نہ تھے بال کافی سپید مہچکے تھے لیکن طبیعت ایسی مردانہ پائی تھی کہ ان کے  
 کسی فعل سے کبھی یہ نہ محسوس ہوا کہ مولانا کی رفتار رفتار یا کردار میں تھکن کا  
 کوئی شائبہ بھی تھا۔ منہ لیس مارتے پیدل آئے ہیں اور اپنے لمبے رد مال سے  
 پاؤں کی گرد طاقت و اعتماد سے جھار کر کسی مونڈہ یا چارپائی پر بٹھ گئے۔ نہ  
 زبان سے کوئی ایسا فقرہ کہیں گے اور نہ تیور سے اس کا پتہ لگے گا کہ تھکان  
 غالب ہو۔ اسی طور پر جب اٹھ کھڑے ہوتے تو نہ بوڑھوں کی طرح کمر پر ہاتھ  
 رکھ کر کسبند ہو کر یا آہ کر کے کھڑے ہوتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا جیسے تازہ دم  
 اٹھ رہے ہیں۔

ان کا ڈھیلا ڈھالا کھدر کا لباس، سپاہیانہ عمامہ ہاتھ میں ڈنڈا قدم  
 لے لے اور ہموار جیسے کوئی قواعد پر پڑ کر رہا ہو۔ کوئی واقعہ ہو کسی حال میں ہو۔  
 یہ ناممکن تھا کہ قدم کی لمبائی میں ایک سانچ کی کمی بیشی ہو جائے یا رفتار میں  
 جھول آجائے مسجد جا رہے ہوں، کلاس پڑھا کر نکلے ہوں، دوستوں کے  
 ساتھ ہوں یا جنازہ کے ہمراہ اس مستعدی سے بڑھتے تھے جیسے ہر بات  
 میں ہر شخص سے سبقت کرنا چاہتے ہیں۔ خوشی ہو یا غمی لب و لہجہ کے مردانہ پن  
 میں فرق نہیں آنے پاتا تھا۔ کوئی محفل ہو کسی شخص کا سامنا ہو مرحوم کہیں چھکتے  
 نہیں تھے۔ بڑے سے بڑا آدمی ہو ہمیشہ گفتگو اس طور پر کرتے جیسے کسی اپنے  
 برابر کے آدمی سے مل رہے ہیں۔ لہجہ میں استواری، بات میں صفائی، چہرہ پر  
 مردانگی، انداز میں شگفتہ سنجیدگی آتے تو لوگ خوش ہو جاتے جاتے تو بڑی  
 خوش آئند قضا چھوڑ جاتے۔

میرے مکان کا صدر دروازہ آتے جاتے پہلو پر پڑتا جو بالعموم کھلا رہتا  
 تھا۔ مرحوم کا معمول تھا کہ کسی نہ کسی وقت ضرور آ جاتے۔ کوئی ہمان ہوا تو  
 اس سے تھوڑی دیر تک گفتگو میں آگیا تو خیر ورنہ اطلاع کبھی نہ کرائی۔ اندر  
 بچے سُن پاتے کہ مولانا شریف لائے ہیں تو بھاگ کر باہر آتے، مولانا بھی  
 اسی انتظار میں ہوتے ورنہ ہی سے کہتے بھاگ آ بھاگ آ اور عبا میں چھپ جاتے۔  
 میں آتا تو پوچھتے بتاؤ مٹی کہاں گئی، میں کہتا معلوم نہیں البتہ آپ کے عباس

نیچے دو پاؤں نظر آ رہے ہیں کہتے ارے وہ تو چلی گئی اپنے پاؤں چھوڑ گئی۔ یہ کہتے اور اس کا پاؤں عبا ہی سے ڈھانکتے جاتے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ میدان سے گزر رہے ہیں بچوں نے دیکھ پایا۔ سب کے سب شور مچاتے پہنچ جاتے اور کہتے عبا میں چھپائے مولنا کتنے ہی ضروری کام سے جاتے ہوں فوراً ٹھہر جاتے۔ ہر چار طرف طلباً اور لوگ آتے جاتے ہوتے مولنا ان بچوں کی فرمائش کو پورا کرتے اور آئندہ روزندگان سے پوچھتے بتاؤ فلاں بچہ کہاں ہے۔ لوگ بھی ٹھہر جاتے اور مولنا کی اس تفریح کا تماشا دیکھتے کئی بجے ہوئے اور عبا میں جگہ نہ ملتی تو کسی کو اپنا ڈنڈا دیدیتے کہ اے گھوڑا بنا کر دوڑا۔ ورنہ کاندھے سے وال اتار کر اس پر ڈال دیتے اور اُسے بھی چھپالیتے۔

جاڑے میں کھدڑ کی پوری استین کا شلو کا پہنتے اور نہایت معمولی داموں کا مکمل خاکڑا عبا کی شکل میں استعمال کرتے۔ صرف گرمیوں میں اکثر بلبے کرتے پر ایک صدری استعمال کرتے لیکن ایسا لباس صرف اپنے گھر پر یا بے تحلف دوستوں کے ہاں جاتے وقت استعمال کرتے۔ ڈنڈا اور عمامہ البتہ کبھی نہیں ترک کیا۔ ڈنڈے کے سہارے سے کبھی نہیں چلے بلکہ اسے اس انداز سے لے کر چلتے تھے گویا سہارا مقصود نہ تھا بلکہ اس سے اظہار اعتماد و افتخار تھا۔

چندہ دینے، سائل کی امداد کرنے اور اچھی چیزیں خریدنے کا بڑا شوق تھا، روپے پیسے کی طرف سے اطمینان نہ تھا لیکن موقع آن پڑتا تھا تو اپنی بساط سے زیادہ صرف کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے کسی قدر آزر دہ ہو کر مرحوم سے کہا کہ آخر آپ اس قدر شاہ خوجی پر کیوں اُتر آتے ہیں مولنا مسکرا کر فرمانے لگے، بھائی دیکھ تو کوئی مانگتا ہے جی تو دیتا ہوں یوں تو پھینکتا نہیں پھرتا میں نے عرض کیا جب آپ کی اس کمزوری سے لوگ واقف ہو جاتے ہیں جی نہ مانگ بیٹھتے ہیں، کہنے لگے اچھا سنو ایک عرب کا قصہ تم کو سنائوں۔

ایک عرب کی ملاقات اپنے جانی دشمن سے ہو گئی، عرب کے پاس نہایت اچھی تلوار تھی، دشمن نے تلوار ہی کی فرمائش کر دی۔ عرب نے بغیر کسی تکلف کے تلوار حوالہ کر دی۔ بات آئی گئی ہوئی، کسی دوست نے عرب سے کہا کہ یہ حماقت کیوں کی۔ تم تو نہتے ہو گئے تھے اگر دشمن نے حملہ کر دیا ہوتا تو کیا کرتے اُس نے کہا ٹھیک کہتے ہو اتنی سی بات میں بھی سمجھتا تھا لیکن اس کو کیا کروں۔ جب وہ مانگ بیٹھا تو میں کیسے نہ دیتا۔ غور تو کرو وہ مانگ بیٹھا!

میں نے بہت کم لوگوں کو مولنا جیسا کنبہ پرور اور ہماں نوا پایا۔ ان کا گھر ہر طرح کے ہمانوں عزیزوں اور نوواردوں سے بھرا ہوتا۔ میں



نے آج تک نہ دیکھا کہ مولنا کے ہاں دو چار جہنی نہ موجود ہوں چکاتے  
وہ سب کو کھلاتے، چائے، کھانا، فواکھات، تعرض اس قسم کی تمام باتیں  
سب کے ساتھ باہر روانہ میں ہوتیں۔ یہ مرحوم کے خانہ دانی روایات  
میں سے تھا۔ وطن میں بھی مولنا کا گھر ہر طرح کے لوگوں کا مامولی و ملجا  
تھا۔ جس کا جی چاہے چلا آئے۔ گھر والوں کی طرح رہے سے کوئی نہ  
پوچھے گا کہ آپ کون ہیں، کیسے آئے کب تک رہتے گا، اس کے ساتھ وہی  
سلوک کیا جائے گا جو خاندان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس سے کوئی تکلف نہ  
برتا جائے گا۔ اس کا جی چاہے تو وہ ہر صحبت میں ہر گفتگو میں بلا تکلف شریک  
ہو۔ بالکل ہی منتہی علی گڑھ میں پندرہ سال تک رہا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ علی گڑھ کے ایک بڑے صاحب اقتدار  
بزرگ مولنا کے ہاں اتفاقاً آگئے، سہ پہر کی چائے ہو رہی تھی۔ جمع دیکھ کر  
وہ جھکے اور دریافت کیا کہ کس کا ”ایٹ ہو“ ہے مولنا بھی مجمع ہی میں ملے  
جلے ایک طرف بیٹھے تھے بولے آجائے اچھائے یہاں ہر شخص ایٹ ہو ہے  
ان بزرگ کو اب تک اس پر تعجب ہے کہ ایک مولوی جس کی آمدنی یا تنخواہ  
بالکل معمولی تھی اتنا شاہ خرچ کیسے ہو سکتا ہے۔

مرحوم کو چائے کا بڑا شوق تھا۔ بڑے تکلف اور تیاری سے چائے پیتے  
تھے۔ جمعہ کی نماز کے بعد مسجد سے ملحق اپنے دفتر کے کمرہ میں کچھ دیر قیام فرماتے

مرحوم کے اجاب اور معتقدین بھی آجاتے چائے کا دور ہوتا، سب لوگ  
لطف و اطمینان کے ساتھ گفتگو کرتے اور مرحوم کی بنجیدہ پر خلوص اور شگفتہ  
باتوں کے مزے لیتے۔ یہ ہمیشہ کا معمول تھا۔ اُس حلقہ میں بیٹھنے والے اس  
بات کا فخر و مسرت کے ساتھ اظہار کرتے کہ نماز جمعہ کے بعد مولانا کے ہاں  
بیٹھ چائے پئی اور گفتگو کی۔

رمضان شریف میں جب مرحوم مسجد میں معتکف ہوتے تو بھی یہ ایک  
خاص بات سمجھی جاتی کہ مولانا سے اعتکاف میں ملاقات ہوئی۔ ہم کلامی و  
ہم نشینی کا یہ وقت اتنا اچھا گزرتا تھا کہ لوگ اس کو دن کا بہت اچھا واقعہ  
خیال کرتے تھے۔ مسجد کے شمالی سرے کی آخری حراپ میں مولانا معتکف  
ہوتے تھے اور چونکہ اس زمانہ میں کہیں ملنے لانے جا نہیں سکتے تھے اس لئے  
ہر شخص کو اپنے اپنے معمولات میں خلا سا محسوس ہوتا اس لئے بالالتزام مولانا  
سے ملنے مسجد میں جاتا۔ ہر شخص سے اس کے مذاق کی گفتگو کرتے، عطر پیش  
کرتے، دو چار باتیں ہنسی کی بھی کرتے اور ایسا ظاہر کرتے کہ نہ روزہ کی کئی  
تکلیف ہو اور نہ اعتکاف کی پابندی گراں ہے بلکہ ان دونوں کو وہ ایک  
ایسا رنگ ویدیتے تھے کہ یہی چیزیں خوش آئند معلوم ہونے لگتیں اور لوگ  
مولانا کے ہاں جانا اتنا ہی ضروری سمجھتے تھے جیسے سیر و تفریح کے لئے  
جاننا یہ مولانا کی سیرت کا عجیب پہلو تھا کہ اُن کے معمولات ”دوسروں کے

لئے ”ادارہ“ بن جاتے تھے۔ نماز جمعہ کے بعد مولانا کا اپنے دفتر میں ٹھہرنا اور چائے پینا یا اعتکاف میں بیٹھنا مولانا کے معمولات میں سے تھا لیکن دوسروں کے لئے یہی صحبت ایک معاشرتی ادارہ کی صورت اختیار کر لیتی تھی اور جب تک یہ لوگ اس حلقہ میں بیٹھ نہ لیتے تھے ان کے روز پر و گرام کی تکمیل نہیں ہوتی تھی یہی وہ مقام ہے جس کے بارہ میں صغیرؒ لکھا ہے۔

زندہ ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے

جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

موسم سے مروجہ بھی متاثر نہ ہوئے۔ پنجوقتہ نماز مسجد میں پڑھی اور پڑ جاڑوں میں فجر کی نماز اول وقت مسجد میں جا کر پڑھانی کوئی معمولی نہیں ہے۔ مغرب کی نماز پڑھ کر دوستوں میں آ بیٹھتے اور عشاء کے وقت ہو جاتے۔ اکثر ہم لوگ مولانا سے عرض کرتے مولانا کہاں جائیے گا؟ اکثر منشی جی ہی کو امامت کا افتخار حاصل کرنے دیجئے۔ کہتے نہیں بھائی جی کے پیچھے نماز پڑھنے سے لوگ گھبراتے ہیں طلباء کا سابقہ ایسے ہونا چاہئے۔ تم لوگوں کا جی چاہے تو بیٹھے رہو میں نماز کے بعد آ جاؤ اکثر منشی جی کو نماز پڑھانے کا موقع دیدیتے یہ محض ہم لوگوں کا د لینے کے لئے ہوتا۔

اکثر ایسا بھی اتفاق ہوا کہ مولانا کسل محسوس کر رہے ہیں یا بڑے لطف کی گفتگو ہو رہی ہو یا کسی کام میں بڑے انہماک سے مشغول ہیں کہ نماز کا وقت آگیا۔ مولانا چاق ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور نماز پڑھانے چل دیں گے اس طور پر جیسے ان میں نئے سرے سے تازگی پیدا ہوئی ہو یا کوئی بڑا خوشگوار فرض یاد آگیا۔ لطف یہ کہ ایسے مواقع پر وہ کسی کو قطعاً نہیں ڈالتے اور یہ محسوس نہ ہونے دیتے تھے کہ وہ تو نماز پڑھانے جا رہے ہیں اور لوگ خوش گیلیوں میں مصروف ہیں۔ جیسا کہ بعضوں کا رویہ ہوتا ہے یعنی کوئی شرعی فرض بھی بچا لائیں گے تو اس طرح دیکھ دو سروں کو نہ جائے فرار بلکہ نہ جائے عاقبت۔

ایسے لوگ ہم میں آپ ہیں اکثر میں گے جو فریضہ مذہبی ادا کرنے کے لئے اس طور پر تیار ہوتے ہیں گویا ان کا عبادت الہی کے لئے آمادہ ہونا ہی دوسروں پر عذاب الہی نازل ہونے کا موجب ہو گا۔ عبادت الہی یہ ضرور کرتے ہیں لیکن ان کی دلی آرزو یہ ہوتی ہے کہ خدا ان کی عبادت کو اپنی تجید و تسبیح نہ سمجھے بلکہ غافلوں کے خلاف مقدس چغلی سمجھ لے اور اسی اعتبار سے ان کو جزا اور دوسروں کو سزا دے۔ یہ جنت میں۔

”سرکاری گواہ“ بن کر جتنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔  
 آہ، مولانا مرحوم ایسے نہ تھے۔ انہوں نے مذہب کو ڈرامہ دھماکے

یا فخر و نیدار کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ ہم لوگ کبھی کبھی دینی یا دنیوی امور میں خوش طبعی یا سہل انگاری کو دخل دے جاتے تو مولانا ہنس کر بڑے لطف و مرحمت سے فرماتے ”ارے بس کر بھائی بس کر بڑا شہر ہے اس سے جان بچانی مشکل ہے“ لیکن ہم جو کچھ کرتے وہ اس بنا پر ہوتا کہ مولانا ہم کو اور ہم مولانا کو عزیز تھے۔ وہ جانتے تھے کہ معاملہ کیا ہو۔ مولانا ہم کو ناظم دینیات کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اچھے انسان کی حیثیت سے عزیز رکھتے اور مولانا بھی ہم لوگوں کو انسان ہی سمجھتے تھے اور یہی وہ رشتہ تھا جس نے ہم دونوں کو ایک جان دو قالب بنا رکھا تھا۔ ایک دن باتوں باتوں میں کہہ گئے۔ ”میاں دوسرے مذاہب پر زور دیتے ہیں اسلام اخلاق و اعمال پر نظر رکھتا ہے مسلمان کا ہر فعل گناہ ہے یا ثواب“ اس کے بعد جاؤ، جو جی چاہے کر دیا۔

یونیورسٹی کے قانون کے ماتحت نماز نہ ادا کرنے پر جرمانہ ہوتا ہے، جن طلباء پر جرمانہ کی سزا عائد کی جاتی وہ معاف کرنے کے لئے مولانا سے پاس آتے ان سے مولانا بڑے لطف و شفقت سے پیش آتے، نہ بھڑکتے نہ کھڑکتے اور نہ ان کو شہر مندہ کرتے۔ باتوں باتوں میں نماز نہ پڑھنے کے وجہ دریافت کرتے پھر کہتے ”میاں تمہارا یہ زمانہ بے فکری اور آرام کا بھی ہو اور پابندی و ریاضت کا بھی بڑے ہو گے تو اس زمانہ کی فرقی

یا غفلتوں کو یاد کر کے مسرور یا ملول ہو گے۔ اس لئے موجودہ زمانہ کو غفلت میں مست گنواؤ۔ اس وقت دکھ درد میں اپنے ماں باپ یا سرپرستوں سے تقویت حاصل کرتے ہو جب بڑے ہو گے تو ماں باپ یا سرپرست کوئی نہ ہو گا اُس وقت بھی سہارے کی ضرورت ہوگی وہ ایسا وقت ہوگا جب اُس سہولت سے تم کو سہارا نہ ملے گا جو اس وقت میسر ہے اس لئے اسی وقت سے خدا کا سہارا ڈھونڈو تاکہ موقع پڑ پھٹتا ورنہ ہو جاؤ جہان معاف کیا جاتا ہے۔

کلمہ کا سرطان موت کا بہانہ بنا۔ ڈیڑھ دو سال سب کچھ کیا گیا لیکن ہوا وہی جس کا یقین تھا۔ ایسا یقین جو ماننے بھلانے کے حدود سے باہر ہو چکا تھا کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی گئی۔ ڈاکٹر حکیم وید سیانے دوائے سمجھی سے رجوع کیا گیا۔ مرض میں تھوڑا بہت تغیر ہو جاتا تھا لیکن قابل اطمینان صورت بھی نہ ہوتی۔ لاعلاج مرض اور محبوب مریض کی مسلسل تیمارداری، دوا و دوش، زیریاری اور ہر دم کا یہ احساس کہ اندوہناں انجام قریب تر آتا جا رہا ہے کیسا مستقل ذہنی کرب ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا اس سے سابقہ ہوا ورنہ خدا نہ کرے کسی کو ایسا سابقہ ہو۔

لیکن محروم تھے کہ اپنی جگہ پر نہا کھڑے تھے جیسے کوئی مجاہد تہمتا

دشمنوں کے سامنے ہوتا تو اور ٹوٹ چکی ہو، زخموں سے جسم پاش پاش  
 ہوتا تھے دیوار ہو سو سوج ڈوبنے والا ہوا اور موت کے پرندے دم بدم بڑھتے  
 والی نو بہ بنوا دیتے بہ تہہ تاریکی میں تہیج تہیج اور جھپٹ جھپٹ کر ایک دوسرے  
 کا راستہ کاٹ رہی ہوں۔ دل میں خدا جانے جذبات کے کیسے کیسے  
 مد و جزا بھرتے تھے رہی ہوں گے لیکن لبوں پر شگفتگی آواز میں امید و انتہا  
 اور آنکھوں میں روشنی جھلکتی رہی۔ ہر اس ونا امید کی کا کوئی اثر نہیں  
 تیار داروں کو تھکتے ملنے والوں کو تسکین دیتے۔ نہ کراہے نہ بیزار ہوئے  
 نہ اپنی تکلیف کا خود اظہار کیا نہ دوسروں سے اس کا تذکرہ کیا۔ پھل  
 گئے لیکن پلے نہیں۔

رخسارہ میں سورخ ہو گیا تھا۔ دانتوں سے کچھ چاہ نہیں سکتے تھے  
 صرف رقیق غذا پر مدار تھا وہ بھی کس مصیبت سے فرو کی جاتی تھی ایک  
 دن میں معبود تھا دودھ پینے کی کوشش کر رہے تھے جو بار بار رخسارہ کے  
 سورخ سے نکل جاتا تھا۔ کبھی ناک میں چڑھ جاتا کبھی چھینک یا کھانسی آئے  
 لگتی تھی۔ کپڑا تر تیر ہو رہا تھا۔ میری طبیعت بھرائی لیکن مرحوم کے منہ سے  
 کوئی کلمہ یا یوسی یا بیزاری کا نہ نکلا اور نہ تھکنے مارنے کا اظہار کیا۔ پھل  
 دو چار تو لے دودھ کے فرو ہوئے ہوں گے لیکن مرحوم نے پیالہ اس  
 انداز سے واپس کیا جیسے خوب آسودہ ہو چکے ہیں یہ صرف تیمار داروں

کی دلہن ہی کے لئے تھا۔ ہاں یاد آیا اتنا ضرور فرمایا ”یہ دن بھی گزری جائیگا۔“  
 گزشتہ عید میں اس قابل نہیں رہے تھے کہ مسجد جاسکتے۔ چنانچہ  
 مردانہ میں چار پائی پردھوپ میں لیٹے سامنے تین طرف کرسی اور نوٹھے  
 دوزدورت تک بچھا دئے گئے۔ ملنے والوں کا اتنا بندھا ہوا تھا۔ جو اتنا  
 مولنا کی تکلیف اور معذوری کا خیال کر کے سلام کر کے دور ہی بیٹھ جانا  
 چاہتا۔ مولنا اُسے اپنے پاس بلاتے، مصافحہ کے لئے خود ہاتھ بڑھاتے،  
 ان کی گرفت میں اب بھی توانائی تھی۔ پاس سے عطر اٹھا کر دیتے، اس وقت  
 ہل گنگو کر لیتے تھے۔ ہر آنے والے کا خیر صفت دم آنکھوں کی پر معنی و برکت  
 بنش سے کرتے۔ لطف کے بھی دوچار کھلے کتے۔ گھر سے کوئی بچہ آ نکلتا  
 دُلسے اپنے پاس بلاتے اس کی آرائش و زیبائش کی خاص انداز سے  
 داد دیتے۔ خوش دلی اور خوش فعلی کا اظہار کرتے اور اس کو کسی طرح  
 یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ خود کس اذیت میں مبتلا ہیں۔

مردم کا معمول تھا کہ عید و بقر عید کی نماز شروع ہونے سے ذرا  
 پہلے جگہ جگہ کھڑے ہو کر تلبیہوں کی تعداد اور قیام و قعدہ کے طریق بتاتے  
 تھے۔ ان کا ایک فہرہ اب بھی یاد آتا ہے..... بدوں ہاتھ باندھ سے  
 لورٹ میں چلے جائے، ہر شخص سے معافہ کرتے۔ ہزاروں آدمیوں سے  
 غلے ملنا اور خوشدلی کا دامن نہ چھوڑنا برا مشکل کام ہے مسکرا کر آزادی



اور شفقت سے گلے ملتے ملتے میں کسی کو کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ کسی سن سیدہ  
 سنجیدہ، متعقبات، یا متبحر عالم دین یا صرف مولوی سے مل رہا ہی بلکہ ہر شخص  
 یہ سمجھ کر ملتا اور ملنے کے بعد محسوس کرتا کہ وہ ایک اچھے آدمی اور مخلص و  
 خوش باش دوست سے مل رہا ہے یا مل چکا ہے۔ گزشتہ ہی عید کا موقع  
 تھا حاضرین میں سے کسی صاحب نے کہا، مولانا آج عید میں آپ کو نہ دیکھ  
 کر طبیعت بہت اُداس ہوئی۔ مسکرا کر فرمایا، انشاء اللہ آئندہ عید میں اس  
 کا موقع ملے گا اس حالت میں بہت کم لوگ اس طرح کا فقرہ بے ساختگی  
 سے کہہ سکتے ہیں۔

مولانا کے قویٰ اتنے اچھے اور ان کا مزاج طبعی اتنا صحیح کہ مرض اپنے  
 شائد کے آخری حدود تک پہنچ گیا لیکن مرحوم کو عوارض متعلقہ میں سے  
 کسی کا سامنا نہ ہوا کسی قسم کی اندرونی یا بیرونی خلش نہیں پیدا ہوئی  
 مدتوں اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے رہے اور اس دم خم کے ساتھ کہ کسی کو اصل  
 مرض کا علم نہ ہو تو وہ صرف یہ اندازہ کر سکتا کہ کوئی معمولی سا مہمورہ یا مہسور  
 ہو جس پر ٹپی بندھی ہوئی ہے۔ اس عمر اور اس مرض میں نظام جسمانی کا  
 توازن اور قوت ارادی کی یہ خستگی حیرت انگیز ہے۔

جب تک بالکل ہی صاحب فراموش نہ ہو گئے فرائض متعلقہ یا بندہ  
 تندرہ ہی سے بجا لاتے رہے۔ ایک بار پرووائس چانسلر صاحب مولانا کو دیکھ

گئے۔ مرض شدت پر تھا گفتگو مشکل سے کر سکتے تھے۔ زنان خانہ میں ملاقات ہوئی۔ پرووائس چانسلر صاحب نے چاہا کہ کچھ تسکین اور ہمدردی کے الفاظ کہیں مولانا نے سبقت کی۔ اور مسجد کے جنوبی سلسلہ عمارات میں ترمیم کا نقشہ پیش کیا۔ اسی دوران میں مسجد کے بعض دیگر انتظامی مسائل بھی چھڑ گئے اور اس اعتماد سے گفتگو کی جیسے کوئی شخص تندرستی کی حالت میں اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا ہو اور سمجھتا ہے کہ ایسا ہو گیا تو اس کے کارناموں میں بڑا اضافہ ہو جائے گا پرووائس چانسلر صاحب چلنے لگے تو چند کلمات تسکین و ہمدردی کے کہے۔ مرحوم نے ان کلمات کی قدر کی لیکن اس طور پر بالکل نہیں جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل جائے بلکہ اس بشارت و دلیری سے جیسے وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہی نہ تھے۔

”مولانا سلیمان اشرف صاحب مرحوم“ کے جنازہ کے ساتھ قبرستان تک بڑی پامردی سے گئے وہاں نماز جنازہ پڑھانے کا سوال اٹھا تو اس بنا پر معذوری کا اظہار کیا کہ رخسارہ کے زخم سے ریم آتی تھی لیکن ان کے بشرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اس معذوری کا کیسا شدید صدمہ تھا۔ قبرستان واپس ہوتے ہوئے فرمایا، اس آخری خدمت کے بجائے لانے کا افسوس ہو، سردار اٹھ گیا!

اس ستر چکی ہال میں کسی کے پذیرائی کی تقریب تھی مرض کی ابتدائی

حالت تھی لیکن تکلیف بہت تھی۔ اس موقع پر مولانا کو جلسہ کے افتتاح کے سلسلہ میں کلام پاک کی تلاوت کرنی تھی۔ ہم سب نے عرض کیا کہ مولانا آپ تکلیف نہ فرمائیے کوئی اور تلاوت کر دے گا۔ فرمایا، نہیں، کوئی مضائقہ نہیں، ایسی بھی کیا تکلیف کہ کلام پاک کی چند آیات نہ تلاوت کر سکوں چنانچہ مولانا ٹھیک وقت پراسٹریجی ہال پہنچے سر اور رخسارہ پر پی بندھی ہوئی تھی چہرہ تکلیف سے متمایا ہوا تھا۔ لیکن وقت آیا تو اپنا ڈنڈا لٹے ہوئے ڈاس پر پورے وقار اور مستعدی سے آئے۔ آواز میں کہیں ترنزل یا تذبذب نہ تھا۔ چند آیتیں تلاوت فرمائیں اور براہ راست مکان واپس آ گئے۔

مرض بہت کچھ بڑھ چکا تھا ایک دن شام قریب تھی سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ہم سب کے بڑے دیرینہ شناسا ایک افغانی بھائی آ گئے جو مشک زعفران، بعض ادویات نشال اور سمور وغیرہ کی گشتی تجارت کرتے تھے۔ حاضرین پر ایک طرح کی اداسی چھائی ہوئی تھی، خان کا غیر متوقع ایسی حالت میں آنا ہم لوگوں کو گراں گزرا لیکن مولانا نے اس ضغطہ کو بڑے لطف و ہمت کے ساتھ دور کیا۔ لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا دیا۔ مصافحہ کے بعد اشارہ سے فرار پر سی کی اور لمحہ بھر بعد ٹر کھڑا تو آواز میں لیکن لطف کے ساتھ پوچھا، کیوں خان ہمارے لئے کیا لائے، خان نے جواب دینے میں تامل کیا تو بولے زعفران اور مشک لائے ہو۔ خان نے کہا، مولانا

اللہ آپ کو شفا دے۔ سب کچھ حاضر کروں گا۔ مرحوم نے بڑے شوق سے ساری چیزیں دیکھیں اور بہت کچھ خریدیں۔ اُسی لطف و شوق سے جیسا کہ تندرستی میں کیا کرتے تھے۔

مسلل مصائب بالخصوص بیماری کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ انسانی کمزوریوں کو ابھار دیتی ہے، آدمی زود سنج اور تنگ مزاج ہو جاتا ہے، صحت و عافیت میں جن لوگوں کی طبیعت متوازن ہوتی ہے، مرض و مصیبت میں بالعموم یہ توازن قائم نہیں رہتا۔ میرا اور مولانا کا مسلسل دن رات کا پندرہ سال تک ساتھ رہا۔ میں نے ایک دن بھی یہ نہ دیکھا کہ مولانا کسی پر برہم ہوئے ہوں یا زبان سے کوئی غیر ثقہ کلمہ نکلنے دیا ہو۔ بچوں پر چھوٹوں پر نوکروں پر بعض نامعقول لوگوں پر آدمی کبھی نہ کبھی غصہ کرتا ہی ہے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ مولانا کبھی کسی حال میں آپے سے باہر نہیں ہوئے۔ کم سے کم میں نے ان کو کبھی اس حال میں نہ دیکھا ہمیشہ سنجیدہ یا شگفتہ پائے گئے۔

اس مسلسل و مسلک بیماری میں وہ ہر مرحلہ سے گزرے ہر طرح کی سختیاں جھیلیں، توقعات کے خلاف اس سلسلہ میں ان کو مایوسی بھی ہوئی سخت زیر بار ہوئے بعض صدمے بھی اٹھائے لیکن کوئی نا ملائم کلمہ کسی کے خلاف کبھی نہ نکالا۔ پیورے بھی کبھی مایوسی یا بیزاری کا اظہار نہ کیا۔ ایک دن

تکلیف زیادہ تھی، تھوڑی بہت گفتگو کر لینے پر قادر تھے لیکن تکلیف کا  
ایسا غلبہ تھا کہ گفتگو کرنے کا یا رانہ تھا۔ اتفاق سے اُسی دن ایک مہجر  
بزرگ ملنے تشریف لائے اور مولانا سے ہمدردی کی گفتگو شروع کر دی  
مولانا نے فرمایا الحمد للہ اچھا ہوں۔ جواب میں یہ کلمہ ہمیشہ مولانا کی زبان  
سے نکلا۔ مزید گفتگو ہوئی تو فرمایا، دیکھئے تو کتنی عمر پائی اور کس فراغت و  
عزت سے زندگی بسر ہوئی۔ آخر کوئی وقت تو آتا جب یہ دور ختم ہوتا۔  
اللہ کا شکر ہے کہ اس حال میں ہوں۔ ممکن تھا کہ اس سے بھی بدتر  
حالت ہوتی!

جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو زبان خانہ سے نکلنا ترک کر دیا تھا۔  
ملنے والے وہیں مل آیا کرتے۔ میں عرصہ سے دیکھنے نہیں گیا تھا۔ یہ میری  
نامعقول کمزوری ہے میں ایسی حالت میں کسی کو نہیں دیکھ سکتا۔ آدمی  
بھیج کر بلوایا، اندر پہنچا تو تخلیہ تھا، میں نے ڈرا دور بیٹھنا چاہا اشارہ سے  
قریب بلایا اب گفتگو کرنے میں بڑی دقت ہونے لگی تھی اس لئے خود  
میں نے کچھ نہ کہا۔ ہاتھ اور آنکھ کے اشارہ سے پوچھا کہاں تھے۔ میں نے  
عرض کیا مولانا بس یوں ہی نہیں آنا ہوا، خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا حالانکہ  
خیریت دریافت کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی تھی اس لئے کہ کوئی طہینا  
بخش خبر کبھی نہ ملی۔ اور نہ اس کی توقع ہوتی۔ لوگ سچ کچھ آپس میں نہ کرہ کرتے

امسی پر اکتفا کر لیتا تھا اور چاہتا کہ یہ تذکرہ ختم ہوا اور کوئی دوسری بات شروع ہو جائے۔ مرحوم تھوڑی دیر تک خاموش میری طرف دیکھتے رہے پھر بڑی کوشش سے اٹک اٹک کر کڑا صاف لفظوں میں فرمایا، پریشان نہ ہوا اللہ نے چاہا تو اچھا ہو جاؤں گا۔

اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے بے اختیار کہنا شروع کیا، مولنا کیا کروں جو کچھ بس میں تھا سب کر دیکھا۔ اب کچھ بن نہیں پڑتی اپنے بس کی چیز تو روپیہ پیسہ دوڑ دھوپ محبت اور ماتم ہی ہے۔ یہ سب بیکار ثابت ہوئے اب تو صرف دیکھتے رہنا رہ گیا ہے۔ اس کی بھی بہت نہیں رہی۔ مولنا بڑے غور سے سنتے رہے۔ پھر ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور دیر تک پکڑے رہے۔ داہنا ہاتھ خالی تھا اسے اٹھایا اور انگشت شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ کیا معلوم ہوا جیسے کوئی چیز گلوگیر ہے ہلکے سے کھانٹ کر گلا صاف کیا اور بولے ”وہ دیکھتا ہے“۔

میں چلا آیا۔ یہ آخری ملاقات تھی تعطیلوں میں میں پہاڑ چلا گیا جس رات کو روانہ ہونے والا تھا طبیعت کا عجیب حال تھا جی چاہتا تھا کہ مولنا کو آخری بار دیکھ آؤں اس لئے کہ سمجھتا تھا کہ اب دائمی مفارقت کی ساعت دور نہیں ہے۔ دوسری طرف اپنے میں اس کی سکت نہ پاتا تھا کیا دداشت کی اس آخری نقش کی کسک کبھی دل سے محو کی جاسکے گی۔

دیر تک اسی جیض میں رہا۔ بالآخر اس فیصلہ پر پہنچا کہ سلام کر ہی  
 آؤں۔ وہاں پہنچا تو درودِ لوار اور وہ تمام چیزیں، اشخاص اور یادگاریں  
 ایک غمناک ہجوم میں بڑھتی پھلتی دل و ذہن پر چھا گئیں جن سے سالہا  
 سال سے سابقہ تھا۔ ہمت چھوٹ گئی اور سلام کے بغیر لوٹ آیا۔ تعطیلوں  
 بعد واپس ہوا تو مرحوم اپنے وطن جا چکے تھے، اور وہیں سے مقررہ وقت  
 پر نہ ایک ساعت ادھر نہ ایک ساعت ادھر جوار رحمت میں پہنچ گئے۔

---

# مرحوم اصغر گوندوی

انداز میں جذبات میں سب شمع شبتاں کے

اک جن کی دنیا ہے خاکِ تری پروانہ

دنیا کی بھلی یا بری باتیں دنیا کے بھلے یا برے لوگوں سے ثابت  
ہوتی ہوں یا نہیں سمجھ میں اسی طرح آتی ہیں ماں باپ بھائی بہن احباب  
سب کی محبت میری سمجھ میں تو اپنے ہی ماں باپ بھائی بہن اور دوستوں  
کی محبت سے آئی۔ اصغر صاحب مرحوم میں خوبیاں تھیں۔ ممکن ہی نہیں  
یقین ہو دو سروں میں بھی ہوں گی لیکن مجھے وہ خوبیاں اس لئے زیادہ  
عزیز تھیں کہ وہ اصغر صاحب کی خوبیاں تھیں جن کی ذات نے ان کو عزیز  
تر و گرامی تر بنا دیا تھا۔

---

اصغر صاحب مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۵ء کے جارتوں میں  
مدرسۃ العلوم کی پچاس سالہ جولائی کے موقع پر علی گڑھ میں ہوئی تھی غیب  
اتفاق یہ ہے کہ مولانا اقبال احمد صاحب سہیل (علیگ) اسی کے توسل سے  
ہوئی جنہوں نے ذکر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۵ء میں کرائی  
تھی۔ اس وقت تک میں اصغر صاحب کی ذات یا کلام دونوں سے نا آشنا



تھا۔ مولنا سہیل سے البتہ پرانی یاد اللہ تھی۔ رات کے آٹھ بجے تھے مولنا  
 اور اصغر صاحب ساتھ ہی میرے مکان پر تشریف لائے۔ میں گھر میں تھا  
 سہیل صاحب کی اطلاع ہوئی تو میں بے اختیار باہر آیا اور بہت سے غیر  
 ذمہ دارانہ فقرے کچھ ادھورے کچھ پورے ورد زباں کرتا آیا اس لئے کہ  
 میں نے مولنا سہیل جیسا بے پناہ برجستہ گواہ اور دقیقہ سنج آدمی اب  
 تک نہیں دیکھا ہے وہ عالمانہ نکتوں اور فکروں کو اس لطف و وضاحت کے  
 ساتھ ایک دوسرے میں سموتے ہوئے بر محل و مسلسل چیت کرتے چلے  
 جاتے ہیں کہ طبیعت عیش عیش کر جاتی ہے میں جانتا تھا کہ انھوں نے یہل کر دی  
 توان کا قابو میں لانا ناممکن ہو جائے گا اس لئے میں گھر سے تیار ہو کر نکلا تھا۔  
 میں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ سامنے ایک صاحب نظر آئے کمرہ چھوٹا تھا  
 دو دروازے بند اور روشنی مدہم کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے جہنمی کے قد و قفا  
 کے مقابلہ میں کمرہ کی وسعتیں لحظہ بل لحظہ سمٹتی جا رہی ہیں دراز قد متوسطہ  
 ستھری و خوش قطع پوشاک سر پر پٹے سڈول بھری بھری فریج کٹ  
 ڈاڑھی سر پر بالوں کی اونچی ٹوپی چہرہ پر آجائال آنکھوں میں خلوص کا  
 گہرائی اور ذہانت کی شکفتگی تیر میں شرافت، متوسطہ عمر انداز میں خود غما  
 و دل آسانی۔ بیک نظروں نے گواہی دی کہ اچھے آدمی سے ملاقات  
 ہوئی یہ اصغر صاحب مرحوم تھے۔

اصغر صاحب کسی قدر جھکے ہوئے تھے جھکنا ایسا تھا جیسے کوئی بڑا آدمی  
 بڑائی اور بھلنا ہٹ سے جھک گیا ہو۔ یہ جھکاؤ اعضا کا نہیں انداز کا جھکاؤ  
 تھا۔ مسکرانا ایسا جیسا کسی واقعہ پر نہیں مسکرا ہے ہیں بلکہ بسم ان کی شخصیت  
 کا وجود تھا۔ ان کا مسکراتا لب و دہن کا مسکرانا نہ تھا بلکہ چہرے کی فضا  
 ہی ایک مستقل شگفتگی تھی۔ مولانا سہیل سے میں بے تحلف ہی نہیں گستاخ  
 بھی تھا۔ مولانا بولے، لو ایک انسان لایا ہوں میں نے کہا شکر ہے آپ  
 نے محسوس تو کیا کہ آپ کے ساتھ کسی انسان کا وقتاً فوقتاً رہنا بہت  
 ضروری ہو۔ بولے، مولانا اصغر صاحب ہیں، اصغر صاحب مسکرا کر آگے  
 بڑھے اور غلغلہ ہو گئے اور میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے محبت اور رحمت  
 کے لمس نے مجھے کششِ ثقل سے آزاد کر دیا ہو۔

مولانا سہیل نے اتنی فرصتِ غنیمت سمجھی اور اپنے بندے ہوئے بستر  
 پر بیٹھ گئے پاس ہی لوٹا تھا اسے اس طور پر اٹھایا جیسے میرے ہاتھ اسے  
 نیچے والے تھے مجھ سے اصغر صاحب کے بکس پر بیٹھنے کو کہا اور ابھی میں  
 بیٹھنے کیا سننے بھی نہ پایا تھا کہ بولے، سنو اصغر صاحب کا ایک شعر سننا ہوں  
 ابھی شعر کی باری نہیں آئی تھی کہ بولے، اصغر صاحب بس کسیرہ رہ گئی کہ  
 داکر نہیں ہیں ورنہ دیکھتے کیا لطف آتا۔ پھر ایک خاص ترنم سے پیشہ  
 رروں کے نہیں بلکہ بھلے مانسوں کے ترنم میں پڑھا۔

زندہ جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے جس جگہ ٹھیکے پی لیں وہی بخا نہ بنے

مولانا سہیل شعر کے بڑے اچھے پارکھ ہیں۔ ذاکر صاحب اچھے شعر سن کر نئی اور اچھوتی دنیا میں بنا دینے میں کمال رکھتے ہیں۔ میں کسی میں نہیں لیکن اچھا شعر مجھ پر کچھ ایسا ہی اثر کرتا ہے جیسے اچھا کام کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک نہیں بنا سکتا کہ مجھ پر شعر کا کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ جو میں نے بتایا ہے وہ محض مثال کے طور پر ہے اور مثال پر مجھے بھروسہ نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں سارا جھگڑا اسی مثال کا سہارا لینے سے پیدا ہوا ہے۔

میں نے کہا مولانا شعر بڑے قریب کا ہے شدا سے بکس و بستر بڑا اور لوٹا ہاتھ میں لیکر غارت نہ کیجئے۔ سب لوگ اطمینان سے بیٹھے کھا آ یا مولانا نے فرمایا اصغر صاحب ذرا روح نشاط تو نکالنا ان کو اشعار سنائوں میں نے عرض کیا مولانا ذرا چھری تلے دم لینے دیجئے۔ جا پڑ رہا ہے انجھٹھی آتی ہے۔ کھانا کھا کر چائے کا دور ہو گا۔ پھر جھوٹا ملا یا جائے گا آپ تو اشعار کا بیوہ کر گئے ہیں۔ اس سے اصغر صاحب کی دنیا اور میری عاقبت خراب ہوتی ہے۔ آپ کا کیا نہ دنیا کے تو نہ عقبنی کے قائل! مولانا ایک خاص انداز سے منہ پر ہاتھ رکھ کر منہ

پاؤں گھٹنے سے موڑ کر کسی پر بیٹھے ہی بیٹھے جھولا سا جھولنے لگے۔ یہ مولانا کے  
اہتمام و اہتراز کی خاص علامت ہے۔

ناظرین معاف فرمائیں، اہتمام و اہتراز ایسے الفاظ استعمال  
کرنے میں مجھے کبھی اور ضرورت نال ہوتا لیکن جب بھلے مانس اور سمجھدار  
موجود ہوں تو الفاظ دقیق ہوں۔ خواہ غیر مانوس ان کے بر محل و بر تکلف  
استعمال کرنے میں ذوق کو تسکین ہوتی ہے۔ جاہلوں اور لیڈروں کے  
اس دور میں دقیق یا نازک مفہوم کو موزوں و مکمل الفاظ سے ادا کرنے کو  
ترس گیا ابھوں کو کون سمجھائے کہ صاحب ذوق عربی، فارسی یا کسی اور  
زبان کے الفاظ قابلیت کی نمائش یا تقصیب کی بنا پر نہیں کرتے بلکہ مافی  
الضمیر کو آسانی سے منفتح کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ عوام یا لیڈر کی سمجھ میں نہ  
لفظ نہ آئے تو ہم خوش و اور ہمارا خدا خوش بہم کب چاہتے ہیں کہ آپ  
نرے احمق اور جاہل بھی ہوں اور ہمارے حواہر پاروں سے ٹھیلنے بھی  
رئے جائیں۔

عوام کو خوش کرنا بڑے ثواب کی بات ہے لیکن کوئی موقع تو ایسا  
لنا چاہئے جب ہم اپنا اور اپنوں کا جی اپنے طور پر خوش کر سکیں۔

سب لوگ اطمینان سے بیٹھے ایسے موقع پر اطمینان سے بیٹھنے کے معنی

اپنے اپنے بستر پر کھافت اور ڈھک کر لیٹ جاتے اور جس کے جی میں جو آئے کہہ گزرتے کے ہیں۔ نہ قوم کے تباہ ہونے کی پروا اور نہ زندگی کے فانی ہونے کا غم۔ آواز دی اندر سے پان آگئے کہ کھٹکی سر دھونے لگی نوکرنے کوٹے والے دینے اندر سے کسی کے بلانے کی ہمت نہ باہر سے کسی صاحب کے آئے کا خطرہ دیند آئی سو گئے جی چاہا بستر ہی پر رقص کرنے لگے۔

مولانا سیل نے فرمایا اچھا اصغر صاحب روح نشاط تو نکالے۔  
مرحوم نے کہا اس کی ضرورت کیا ہے آپ کو تو یونہی سب کچھ حفظ ہی میں نے کہا مولانا زراٹھریئے ابھی پہلا ہی شعر طق سے نیچے نہیں اترتا ہی مولانا نے نہایت متانت سے فرمایا جلدی کیجئے ورنہ پھند لگنے کا اندیشہ ہے۔  
میں نے کہا رند نے طرف تو اٹھالیا لیکن ابھی ساغر بننا باقی ہے۔ اس کے بعد پیٹنے اور میخانے بننے کا سوال آئے گا۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ اصغر صاحب نے جو شعر کہا ہے اسے وہ ہماری دنیا میں آیا دھبی کر سکتے ہیں کہ نہیں بیٹا یوسفی مسلم لیکن دام تو مصر ہی کے بازار میں لگیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں میرے آپ جیسے ناگفتنی موجود ہوں وہاں اصغر صاحب ساغر و میخانہ کی فضا بھی پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اصغر صاحب ہنس پڑے کہنے لگے کیا صاحب ساغر و میخانہ کی فضا ساز نہیں پیدا کرتے کلاں پیدا کرتے ہر شاہ و تر شاہ اقدار و شہادت کا اعلان کرتا ہوں مسجد میخانہ مامدان مصافحہ

کا انتخاب تو ہر شخص اپنے اپنے ظرف سے کرتا جو علی گڑھ میں ساغر و میخانہ کی کیا کمی، کمی تو رندوں کی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک فرمایا لیکن یہ تو بتائیے مولنا سہیل کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کہنے لگے ان کی پوچھنے تمام عمر میخانہ میں رہے تھکے تو محتسب بن گئے۔ میں نے کہا محتسب ہی نہیں گواہ سرکاری بھی۔ علی گڑھ سے نکل کر ان کا یہ حشر ہوا۔ نکالے گئے ہوئے تو یقیناً زندہ ہوتے مولنا بولے نکالا جاتا تو تمہارا کیا حشر ہوتا میں نے کہا وہی جواب اصغر صاحب کا ہے اس پر مولنا اور اصغر صاحب دونوں نے تہقیر لگایا۔

دوسرے دن اصغر صاحب نے نشاط روح کا ایک نسخہ بڑی محبت سے دیا۔ کئی دن بعد مرحوم نے پوچھا آپ نے نشاط روح کا مطالعہ بھی کیا میں نے کہا اصغر صاحب اس وقت مولنا سہیل موجود نہیں ہیں آپ خود کچھ متفرق اشعار سنائیے یہ شخص بلائے بے دریاں ہی شعر سے لطف اٹھانے نہیں دیتا سوچنے کے فکر میں ڈال دیتا ہے وہ دیکھئے احاطہ کے ہمالیہ پر کسی بزمِ حقیقت سے اٹھا ہوا ہے۔ یقیناً اس سے وہ باتیں بیان کر رہا ہو گا جو افلاطون و ارسطو سے کرنا چاہتے تھے اصغر صاحب نے لرایا متفرق اشعار نہ سناؤں گا پوری غزل سنئے شاعر کو اسی طرح سننا چاہئے۔ تصویر سے ہکٹا رہو بچے تصویر دیکھ کر کیا کیجئے گا پھر یہ غزل سنائی

کیسا نرم پیکین و گوارا لہجہ تھا۔  
 گلوں کی جلوہ گری ہر دم کی بوجھ پی  
 گذر گئی ترے مستوں پہ بھی تیرہ شبی  
 یہ زندگی ہی یہی اصل علم و حکمت ہی  
 فروغ حسن سے تیرے چمک گئی سرشت  
 سرشت عشق طلبا و حسن باباں  
 وہیں عشق نے بھی شوریں اُڑائی تہیں  
 کشش نہ جام نگاریں کی پوچھا ساقی

تمام شعبہ ہائے طلسم بے بسی  
 نہ کمکشاں نہ ثریا نہ خوشہ غنی  
 جمال دوست و شبانہ و بادہ غنی  
 او او رسم بلالی و طرز بولی  
 حصول تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی  
 جہاں سے توفے لئے خندہ ہائے زیر لبی  
 جھلکے ہا ہی مرا آب و رنگ تشنہ لبی

دس گیارہ سال ہوئے ایک دفعہ ایسا بیمار پڑا کہ زندگی کے لالے  
 پڑ گئے لکھنؤ مکمل ہسپتال میں مدتوں صاحب فریاشن رہا اس زمانہ  
 اصغر صاحب الہ آباد میں تھے تقریباً ہر آوار کو میں ہسپتال کے بالافا  
 پر اپنے کمرہ کے قریب ٹھیک نو بجے دن کو یاؤں کی ایک خاص آہٹ سنہ  
 دروازہ کھلتا، اصغر صاحب آہستہ آہستہ لیکن مستقل اور ہموار قدموں  
 سے کمرہ میں مسکرتے ہوئے داخل ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ کچھ دیکھ  
 یا محسوس کر کے خوش ہو رہے ہیں سلام علیکم اس لہجہ و انداز سے کرتے ج  
 کوئی خوشخبری سنارہی ہیں۔ کرسی پر بیٹھ جاتے مجھ سے تو کیا کسی اور سے

نہ پوچھتے کہ کیسا ہوں یا کیا ہو رہا ہے بات اس انداز سے کرتے جیسے مجھے  
دیکھنے کے لئے کوئی لمبا سفر کر کے نہیں آئے تھے بلکہ ہسپتال تک ٹہلنے کے  
لئے آئے تھے۔ میری طرف بھی آنکلیے باتیں ایسی چھیڑتے جن کا تعلق دور دور  
تک بھی مرض یا ہسپتال سے نہ ہوتا۔

اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون شیطان کی آنت شائع ہوا تھا میں نے  
ایک بار پوچھا اصغر صاحب یہ آپ ہر ہفتہ الہ آباد سے یہاں کیوں آتے ہیں۔  
اور زحمت وزیر باری اٹھاتے ہیں کچھ سوچا پھر مسکرا کر بولے شیطان کی  
آنت کھینچ لاتی ہی میں نے کہا فرشتوں کو بھی افرمایا فرشتہ کو شیطان بوجھتے  
بھی تو آپ نے سنا ہو گا! میں نے کہا اصغر صاحب تکلیف نہ ہو تو کچھ سناؤ  
اصغر صاحب میری اس (غالباً غیر متوقع) فرمائش پر بہت مسرور ہوئے اور  
ذیل کی غزل بڑے لطف سے سنائی۔

سرگرم تھی ہوا سے جلوہ جانا نہ      اڑ جائے دھواں بنگر کعبہ ہو کہ بت خانہ  
یہ دین دہ دنیا ہی یہ کعبہ وہ بت خانہ      اک اور تدم بڑھ کر لے ہمت فردا نہ  
قرآن تھے میگش ہاں لے نگہ ساقی      تو صورت مستی ہے تو معنی مینا نہ  
بنک بنیں دکھائی کیا اس سُبْحِ خداں کو      اک تار شماعی سے الجھا ہی جو پروانہ  
مانا کہ بہت کچھ ہے یہ گرچی حُسنِ شمع      اس سے بھی زیادہ ہی سوزِ غم پروانہ  
زاہد کو تعجب ہے صوفی کو تحسیر ہی      عذر رشک طریقت ہے یہ لغزشِ مٹانہ



اک قطرہ شبنم پر خوشید ہی عکس آ رہا ہے۔ یہ تہی ہستی و ہستی افسانہ ہے افسانہ انداز میں جذب آئیں سب شمع شبتاں اک حس کی دنیا ہے خاکستر پرانہ گھٹہ دو گھٹہ میٹھ کر واپس جاتے وہ بھی اس طرح جیسے رخصت نہیں ہو رہے بلکہ یوں ہی باہر جا رہے ہیں۔ جب میں صحتیاب ہو کر واپس آ گیا تو ایک عرصہ کے بعد معلوم نہیں کس سلسلہ میں میں نے پوچھا کیوں اصغر صاحب آپ ہسپتال میں آجھے دیکھنے آتے تو آپ پر ایک طرح کی شگفتگی کیوں طاری ہوتی ہے میں نے آپ کو اخلاقاً بھی کبھی فکر مند نہ پایا کیا میری ہمت افزائی مقصود تھی بولے بالکل نہیں اچھا سنئے ایک لطیفہ سناتا ہوں۔

ایک دن میں ایک ڈمی سے مکان واپس آ رہا تھا..... صاحب اسٹہ میں لے اور نہایت غمناک لمحہ میں بولے اصغر صاحب بڑے افسوس کی بات ہے رشید صاحب کا انتقال ہو گیا ایسے تھے ویسے تھے میں سن کر ہنس پڑا اور بولا حضرت جو اس کی باتیں کیجئے انتقال کرنا کیسا ہیں جانتا ہوں وہ زندہ ہیں اور تندرست ہو کر رہیں گے۔ انھوں نے مجھے بدحواس یا ہو توں سمجھا اور لگے اپنی خبر کے موثق ذرائع بتانے گنا نے میں نے کہا یہ سب سچ لیکن میں ہر ہفتہ دیکھ آتا ہوں ان کی پیشانی پر نہایت جلی نقوش میں ”ہیات“ لکھی ہوئی ہے وہ نہ مانے میں نے کہا آپ نہیں مانتے تو آئیے تار دیکر دریافت کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور خیر غلط نکلی۔ رشید صاحب

واقعیہ ہے کہ جب لکھنؤ پہنچ کر آپ کو دیکھتا تو فوراً یہ نظر آتا کہ زندگی اپنی پوری تابش و تازگی کے ساتھ موجود ہے اور میں مسرور و مطمئن ہو جاتا۔

دس بارہ سال تک اصغر صاحب کا ساتھ رہا انھیں میں نے ہر حال میں دیکھا اور ہمیشہ اصغر صاحب ہی پایا یہ محض اتفاق تھا کہ وہ شاعر بھی تھے شاعر نہ ہوتے جب بھی ان کے شرف یا شہرت میں فرق نہ آتا۔ وہ جس موقع یا ماحول میں ہوتے ممتاز و محبوب ہوتے وہ کچھ عالم تھرنے تھے لیکن اردو کے بہت سے شعرا سے کیس زیادہ ذی استعداد و ذی علم تھے۔ بڑی رساطبعیت تھی۔ نئے سے نئے اور پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مسائل کی تہ تک اس سہولت اور صفائی سے پہنچ جاتے کہ کسی گوشہ خمی نہ ہوتا کہ اس مرحلہ سے اُن کا یہ سابقہ پہلے ہی باہر پڑا تھا۔ انگریزی کی خواندگی کچھ زیادہ نہ تھی اور نہ فن تنقید کے جدید ترین اصول سے آشنا تھے لیکن ہندوستانی اکیڈمی کے مشیر ادبی کی حیثیت سے اُن امور سے سابقہ پڑا تو آپ کے قلم سے نہایت متوازن مستند و بے لوث تنقیدیں نکلیں اور ترجمہ تو ایسا کرتے کہ اکثر اصل کا دھوکا ہوتا ہے مسلمان اور مشرقی تھے لیکن میں نے بڑے بڑے مغربیت باؤں کو اصغر صاحب کی بصیرت اور ہمہ جہت شخصیت کا معترف پایا اردو میں عام شہر نگاروں کے برخلاف وہ اپنی تحریر میں زور لگینی اور وزن

پیدا کرنے کے لئے حضور زوائد سے کام نہیں لیتے تھے۔ اردو کے اکثر مستند اہل قلم بھی الف لیلہ کے بکبارہ سے ملتے جلتے ہیں۔ بات اتنی معمولی ہوگی کہ اُسے نہ بھی کہیں تو ہرج نہیں لکھیں گے اس طرح جیسے دواؤں کا شہما لکھ رہی ہیں ہندو مارے ڈالتا ہے، یا محبوب بھاگ گئی ہے۔ مرحوم تحریر میں تقریر دونوں میں حفظ مراتب ملحوظ رکھتے تھے۔ انڈین پریس الہ آباد کی فرائض پرائیوٹ نے ”تحفوں“ کا ایک سلسلہ بچوں کے لئے تصنیف کیا جس میں مختلف ممالک کے حالات سے بچوں کو بڑے دلچسپ انداز سے روشناس کرایا یہی کچھ دنوں لاہور کے ادبی مرکز میں بھی علمی خدمات انجام دیں نتیجتاً کے بعض سلسلے اصغر صاحب ہی کے مرتب کئے ہوئے ہیں اور بڑے مستند اور وقیع سمجھے جاتے ہیں۔

مرحوم نے ایک مستقل تصنیف ”اردو کی ذہنی تاریخ“ شروع کی تھی۔ کئی سو صفحات کا مسودہ ان کے کاغذات میں اب تک موجود ہے۔ لیکن اوراق اتنے بوسیدہ اور گڈ بڈ ہو گئے ہیں اور حواشی اس کثرت سے لکھے ہیں کہ اُن کا مرتب کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

اصغر صاحب کی آمدنی بہت کم تھی لیکن میں نے اُن کو کبھی ننگہ ستار کا شاکہ نہ پایا۔ بڑا خرچ تھا۔ بہت اچھا پنتے تھے اس سے اچھا کھاتے۔ اپنی حیثیت سے زیادہ مدارات کرتے تھے۔ اُن سے دس گنی آمدنی والو

کو بھی میں نے اُن جیسا رکھ رکھاؤ رکھنے والا نہیں پایا۔ اُن کے جسم پر لکھ میں کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی گئی جس سے شبہ بھی ہو سکتا کہ حصّہ خوق پورا کرنے کی خاطر دوسرے یا تیسرے درجہ کے بدل پر اکتفا کیا ہے۔ ان کی ہر چیز میں ذوق و سلیقہ کی شہادت ملتی تھی۔ آج تک میلے اور پیوند گئے لباس میں نہیں دیکھے گئے گفتگو میں ریک یا سخیف فقرے زبان سے نہ نکالتے گفتگو آہستہ کرتے مسکرا کر کرتے اچھے ہمیشہ نرم پُر وقار یا سخیف ہوتا۔ میں نے اُن کو کبھی مایوس، معطل یا مضطرب نہ پایا اُن کے ملنے والے مختلف مہضات مشرب کے لوگ بھی تھے۔ لیکن وہ گفتگو اس انداز سے کرتے کہ اپنی وضع بھی ہاتھ سے نہ جاتی اور دوسرا بھی مایوس یا مہض نہ ہوتا۔

اللہ آباد میں پہلے پہل انھوں نے کٹرہ میں ایک مکان دوکانوں کے ذیل میں لب مشرک لے لیا تھا، بیٹھک میں براق چاندنی کا فرش، تین چار گاؤٹیکے، الماریوں پر روغن دیوار پر قلمی۔ میں ملنے گیا تو پوچھا، کیوں مکان ملنے میں تو دشواری نہیں ہوئی؟ میں نے کہا جی نہیں البتہ زرا شبہ ضرور ہوا کہ آپ کا مکان ہے یا حکیم جمل خاں کا مطب۔ خدا کے لئے اس جگہ کو چھوڑیئے۔ لوگ بیٹھے ہوں تو شبہ ہو کہ یا تو مخصوص امراض کے مریض جمع ہیں یا آپ خاص قسم کے پیر ہیں۔ گھوڑے پر چوکا لگانے سے فائدہ مجھے تعجب ہے، اس پاس کے دوکانداروں نے آپ پر اب تک جہل کیوں نہیں

کس دیا۔ اگر جلد چھوڑنا ممکن نہ ہو تو ہومیو پیتھک دواؤں کا کاروبار کیوں نہ شروع کر دیجئے۔ اصغر صاحب ہنس پڑے فرمایا آپ نے بات ٹھیک کہی مجھے صفائی بہت پسند ہے لیکن معلوم نہیں کیوں جب میں باہر سے آتا تھا تو بیک نظریہ صفائی خود مجھے کھٹکتی تھی۔

بازار میں کوئی چیز نئی آتی تو اسے فوراً خریدتے، دوستوں کو دکھائی جاتی۔ کوئی پسند کر لیتا تو اسی کے نذر کر دیتے۔ ایک دفعہ مراد آباد سے نہایت باریک اور حسین نقشے کی سینی لائے۔ راستہ میں میرے ہاں ٹھہر گئے، سینی دکھائی، پوچھا کئے کیسی ہے میں نے کہا عشوہ ہی عشوہ ”فتوحات“ میں سے ہے یا خریدی ہے؟ بولے جی نہیں، فتوحات کا کہاں کہاں گزریا نہ ملا نہ انگریز۔ خوشی تو خریدنے کی ہوتی ہے میں نے پوچھا کیا قیمت دی، کہنے لگے واہ پسند کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے، سنا نہیں۔

جو کچھ کہا کہ ترا حسن ہو گیا محدود!

بس یہ آپ کی نذر رہے۔ وہ سینی اب تک میرے پاس ہے۔ بچوں کے گھر میں اس کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔ اب مجھے جب کبھی نظر آ جاتی ہے تو اسے منہ خواہوں اسی میں کھانا منگو کر کھاتا ہوں۔ رنگ آمیزیاں غائب ہو چکی ہیں، نقوش دھندلے ہو گئے ہیں میں حافظہ کا کچا ہوں لیکن تاثرات دیر تک قائم رہتے ہیں۔ ان ٹپتے ہوئے نقوش میں اصغر صاحب کی یاد تازہ ہوتی

ہوا اور جاننے والے جانتے ہیں بچھڑے ہوئے دوست کی یاد تازہ ہوتی ہے تو  
 راضی کے سیمائی پردوں پر رنگ و آہنگ، خط و خال، رعنائی و زیبائی کے  
 کیسے کیسے خزیں و حنین نقتے بن بن کر ٹپتے ہیں اور مٹ مٹ کر بیٹے ہیں !  
 اصغر صاحب کھلانے پلانے کے بڑے شوقین تھے۔ میں آنے والا  
 ہوتا تو عجیب عجیب اہتمام کرتے مرحوم کا انتقال فاج میں ہوا۔ پہلا حملہ سپنے  
 کو سمجھ گئے مگر ہاتھ پاؤں کمر در ہو گئے تھے۔ پاؤں مشکل سے ہموار پڑتے۔  
 آخر آخر میں الہ آباد کے سینٹ ہال کے سامنے بلوڈیر کے احاطہ میں ایک  
 مکان کر ایہ پر لے لیا تھا مکان کے احاطہ کے پھاٹک تک ایک طویل راستہ  
 تقریباً یون فرلانگ لمبا چلا گیا تھا۔ میرا الہ آباد پہنچنے کا وقت متعین تھا۔  
 میں نے ہمیشہ انتظار میں انھیں اس طویل سڑک پر ٹپتے ہوئے پایا۔ اس  
 میں کچھ فرق نہ آیا پہلے چپٹ آٹا یا جامہ پہنتے تھے بیماری کے بعد سے  
 غرارہ دار پہننے لگے تھے۔ لمبا پھنسی استینوں کا کرتا، سر پر سپید ٹوٹی ایک  
 ہاتھ میں پاؤں کی ڈبیہ بٹوا، دوسرے میں مختلف اقسام کے سگار سکرٹوں  
 کے ڈبے۔ آہستہ آہستہ سر جھکائے قدم سنبھالتے چلتے ہوتے۔ مجھے  
 اتنا دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے ہائے اُن کا باغ باغ ہونا ازبان سے مرعہ  
 یا مبارک سلامت کچھ نہ کہتے۔ البتہ آنکھوں میں خوشی کی چمک ایسی ہوتی کہ  
 مجھے اپنے قلب میں اترتی معلوم ہوتی۔ بیوں پر سکر ایٹ اور باتوں میں

خدا دہانی کی وہ گھلاوٹ کہ بیان سے باہر ہی خوشی کا اظہار اپنے کسی ارادہ یا اشارہ تک سے نہ ہونے دیتے لیکن سر سے پاؤں تک شگفتہ و زفر مرہ سنج معلوم ہوتے۔

اُن کی باتیں تھوڑی بہت اب تک یاد ہیں کتے رشید صاحب سنا جب سے بیمار ہوا ہوں ذرا زیادہ عیاش ہو گیا ہوں۔ ہر طرح کے پان تہا کو فراہم رکھتا ہوں یہ دیکھئے ہر مارکہ کا سگریٹ ہی ہر ایک کا رنگ جدا ہی۔ ان میں وہی لطف آتا ہے جو مخصوص اجاب کی صحبتوں میں آتا ہی۔ اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے مکان پہنچتے۔ نوکر کو آواز دیتے ناشتہ لاؤ۔ فرماتے یہ لیجئے میں نے ہارکس مالٹڈ بک شرف کر دیا ہے یہ اوولٹین کا گلاس ہی۔ یہ فورس ہے اور ہاں آپ نے کوڈر کے مچھن کھائے ہیں ذرا یہ پوسن بھی ملاحظہ فرمائیے۔ غرضکہ ہر چیز بڑے شوق و لطف سے پیش کرتے پھر کتے ناشتہ کر لیجئے۔ وہ بھی حاضر کیا جائے گا۔ مدتوں سے بانگ احتجاج وے رہا تھا میں نے کہہ دیا تھا دن قریب ہیں آج اسے آپ دبستر خوان پر چاروں شانے چت پائیں گے۔ یہ مرغ مسلم کا عنوان تھا۔ اور ہاں یہ پان لکھنؤ کا ہے آپ علی گڑھ کے پانوں کا پروسیکٹڈ کرتے رہتے ہیں آج لکھنؤ اور بنارس کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ یہ برقی قوام ہے۔ وہ ترغظراتی پتی ہی اور ہاں (نوکر کو آواز دے کر) ذرا وہ گولیاں تولانا حکیم.....

صاحب نے دی ہیں۔ کہتے تھے اُن کے مورث اعلیٰ نے شاہانِ اودھ کے لئے بڑے اہتمام سے اس کا نسخہ تیار کرایا تھا اس کا نام ”آبروے اودھ“ ہے اسے ضرور چکھے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے لیکن اس سے علی گڑھ کی آبرو دیکر کیا اثر پڑے گا کہنے لگے لیتے جائیے جس کی آبرو خطرہ میں دیکھو گا دیدیجئے گا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن میں خوب سمجھتا تھا کہ یہ سارا اہتمام اور لطفِ بیان میرے لئے تھا۔ جو چیزیں اور جو باتیں مجھے پسند تھیں انھیں کوالمصاف کر کے اور خود اوڑھ کر پیش کر رہے تھے اور اس لطف و نزاکت سے کہ مجھے اُن کی اس حکمتِ عملی کو فاش کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ امرودوں کی فصل ہوتی تو اُس کا ایک ٹوکرا ساتھ کر دیتے اور دینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب کو بھینے تھے معلوم ہوا کہ وہ آج کل موجود نہیں ہیں زیادہ تو میں نے رکھ لئے کچھ آپ لیتے جائیے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب نے علی گڑھ میں فرمائش کی تھی تھوڑے انھیں بھی بھیج دیجئے گا۔ ایک بار متعلقین وطن سے علی گڑھ آئے تھے۔ راستہ میں چند ٹھنڈوں کے لئے آلہ آباد میں اصغر صاحب کے ہاں ٹھہر گئے میرا سب سے چھوٹا بچہ احمد گود میں تھا مرحوم کو بچہ کی شکل اور وضع قطع ایسی پسند آئی کہ ٹھیک دہر میں اسے گود میں لئے سنبھلے ٹکڑے پیدل اپنے ایک غریب دوست کے



ہاں اپنے اصغر صاحب کو اس طرح آتے دیکھ کر ان کے دوست اور گھر والوں کو بہت تعجب ہوا۔ سب کے سب دوڑ پڑے کیونکہ اصغر صاحب کو ڈاکٹر نے چار پائی پرنسپل لینے پہنے کی تاکید کی تھی۔ غذا بھی کم کر دی تھی ہفتوں بعد چار پائی سے اٹھے تھے۔ اس لئے بہت نحیف ہو گئے تھے۔ بہتیرا لوگوں نے سمجھایا اور نوکرنے مانگا۔ لیکن احمد کو اپنی گود سے نہ اتارا تھوڑی دیر بعد بچہ کو گود ہی میں لئے واپس ہوئے رشتہ ام تک اس کے ساتھ طرح طرح سے کھلتے رہے حتیٰ کہ دودھ پینے کے لئے ماں تک جانے نہ دیا۔

کچھ دنوں بعد ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا تھا بولے رشید صاحب آپ تو دیکھ چکے تھے (دوست کا بچہ) کتنا خوبصورت معصوم اور پیارا بچہ ہے آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بوس مجھے کتنی الفت ہوا اور اس کے والدین میرے کتنے سچے اور گہرے دوست ہیں۔ اس دن آپ کے متعلقین آئے تو میں نے احمد کو دیکھا آپ اندازہ نہیں کر سکتے اسے دیکھ کر میرے دل پر کیا اثر ہوا۔ اول تو میں بھول گیا کہ بیمار و نحیف ہوں دوسرے دل میں ایک عجیب فخر آمیز نپاڑ پیدا ہوا کہ احمد بوسے کہیں نہ یاد دلش اور پیارا ہے۔ زرا میری بدحواسی تو دیکھے میں نے بچہ کے والدین سے بھی کہ دیا کہ احمد نے بو کو زیر کر دیا۔ چنانچہ جس فاتحانہ انداز کے ساتھ میں گیا اس سے کہیں زیادہ فاتحانہ فخر و مباہات سے واپس آیا۔ احمد

نے میری ایک کمی پوری کر دی۔  
ایک بار خط آیا لکھا تھا ”بلڈ پریشر اور احمد کی محبت دونوں بڑھ رہی ہیں دیکھئے کیا انجام ہو“

مجھے اچھے گلابوں کا بڑا شوق ہے مرحوم اسے جانتے تھے جب کبھی الہ آباد جاتا تو وہ پتہ لگاتے ہوئے کہ کہاں کہاں اچھے گلاب ہیں چلنی ہوتا تو اس سے رسم و راہ پیدا کرتے مجھے لے جاتے اور گلاب پسند کرتے ایک بار ایسے ہی ایک جگہ مجھے لے گئے، ناک سے زیادہ خود ہر گلاب کی تعریف کرتے۔ گلاب یوں ہی سے تھے میں نے اخلاقاً ایک آدمی کی ٹوٹی پھوٹی تعریف بھی کر دی معاً صغر صاحب نے اسے حاصل کرنے کے لئے ڈور سے ڈالنے شروع کئے میں نے موقع نکال کر چپکے سے کہدیا، ”صغر صاحب فکر نہ کیجئے سب کے سب معمولی درجہ کے ہیں۔ مرحوم کو غیر معمولی مائیوسی ہوئی۔ واپسی میں میں نے پوچھا کہ یہ آپ چپ کیسے ہو گئے کئے لگے کیا کہوں گلابوں کے نادر ہونے اور اس شخص کے نام معقول ہونے کا بڑا نہرہ سنا تھا۔ گلابوں کے بارہ میں تو آپ نے فیصلہ کر دیا۔ نام معقول ہونے حال مجھ سے پوچھئے۔ کیخست کسی طرح رام ہی نہ ہوتا۔۔۔۔۔ صاحب الہ آباد کے سب سے مقتدر آدمی کی معرفت اسے قابو میں کیا گیا۔ اس ہاتھ میں نے وقتاً فوقتاً جتنا اخلاق برتا ہے الہ آباد کا کوئی معقول و

شریف آدمی ترنا گوارا نہ کرے گا۔ ٹھیک ہے ایسے مہل آدمی کے گلاب  
کیونکر عمدہ ہو سکتے ہیں ابھر خود ہی ہنس پڑے۔

مجھ میں ایک بد عادت یہ ہے کہ کہیں جاؤں علی گڑھ سے آخری گاڑی  
سے روانہ ہوں گا اور کام ختم ہو جائے پر پہلی گاڑی سے واپس آ جاؤنگا  
مرحوم کی آخری علالت کے زمانہ میں میرا جانا الہ آباد صبح پہنچا شام  
کی گاڑی سے واپس ہونا چاہا۔ مرحوم چاہتے تھے کہ میں رات میں ہی  
قیام کروں۔ ہزار ہزار طریقہ سے وقت ٹال دینے کی کوشش کرتے رہے  
جب دیکھا کہ کام نہیں چلتا تو اصرار کرنے لگے کہ تعطیل کا زمانہ ہے کوئی  
بہر نہ ہو گا۔ صبح چلے جائے گا میں ایسا بد بخت کہ نہ مانا اور شام ہی کی  
گاڑی سے واپس چلا آیا۔

مجھے کیا خبر کہ یہ آخری ملاقات اور پہلا اور آخری ہی اصرار تھا۔  
انکار پر ایسا معلوم ہوا جیسے مرحوم کے چہرے پر تلخ پریں لیکن میں کیا بناؤں  
کس ضبط و پامردی اور کس مرحمت سے فرمایا تو پھر آپ کی خوشی۔ وہ سماں  
اب بھی نکلا ہوں کہ سامنے آ جاتا ہے تو مجھے اپنی اوقات سے نفرت  
ہو جاتی ہے اور اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں میں اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا لیکن  
مرحوم کو میں نے جس طور پر اور جس حالت میں شکستہ خاطر کیا تھا اس کو

پاداش میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں اس اعلان  
و اعتراف سے کبھی کبھی امید بندھتی ہے کہ شاید اپنے نفس کی ملامت  
اور دوسروں کی لعنت کا ہدف بن کر کبھی اور کیسے اصغر صاحب مرحوم  
کی روح کا سامنا کرنے کی ہمت ہو سکے۔  
دو ہی ایک روز کے اندر اندر تارایا کہ اصغر صاحب نے رحلت فرمائی۔

دوسرے دن میں الہ آباد پہنچا۔ بلوڈیر کارا استہ سونا تھا طبیعت  
بے اختیار ہو گئی رخصت و محبت کا وہ پیکر مجسم ہمیشہ کے لئے رخصت  
ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زندگی کی بڑی مضبوط طناب ٹوٹ گئی۔  
زندگی جو عبارت تھی دوست کی محبت و شفقت کی سے اس میں ایک  
غلام پیدا ہو گیا۔ ایسا خلا جس میں بیابانی ہواؤں اور گورستانی  
سناٹوں کے کچھ اور نہ تھا اب ہمہ تن شوق ہو کر میرا کون انتظار کرے گا۔  
میری تحریروں پر کس کو وجہ لگے گا اور کون لے مسرت و فخر سے لوگوں  
کو دکھاتا سنا تا پھرے گا۔ میرا کوئی مضمون شائع ہوتا سب سے پہلے اصغر  
صاحب کا ستائشی خط آتا۔ اصغر صاحب کی رحلت نے مضمون لکھنے  
کا دلولہ بڑی حد تک سرزد کر دیا۔ میرے اچھے یا برے خیالات کا بیشتر حصہ  
مضمون لکھنے کے دوران میں کچھ نشان و گمان معلوم نہیں کیوں اور کس طرح

آتا ہو۔ جب کوئی اچھا خیال یا فقرہ ذہن میں آتا تو اس کی خوشی ہوتی کہ صفر صاحب اس کی داد دین گے اور لکھو بتر لکھو اور جلد لکھو کی انگ پیدا ہوتی اب وہ بات نہیں بعض باتیں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر قلم سے ایسی بھی نکل جاتی ہیں جن کے بارہ میں مجھے خود اندیشہ رہتا ہے کہ شاید اس کی تہہ تک لوگ نہ پہنچیں یا پہنچا گوارا نہ کریں۔ صفر صاحب ہمیشہ سے پیا جاتے داد دیتے اور ملاقات ہوتی تو سب سے پہلے اسی پر گفتگو کرتے۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ میں کوئی بڑا صاحب فکر ہوں یا لوگ میری بات نہیں سمجھتے تو کسی نہمت سے محروم رہ جاتے ہیں ہرگز نہیں شخصی تجربات یا تاثرات کے لئے غیر معمولی فراست یا علمیت لازمی نہیں ہر یہ تو ہر شخص کے بھید ہوتے ہیں جن سے وہ خود ہی زیادہ واقف ہوتا ہے میرا یہاں مطلب صرف اس شخص کی سے ہے جو میرے باریک سے باریک اور نازک سے نازک تاثرات و تصورات سے محروم کو بھی اور جن کے خفیف سے خفیف ارتعاش بھی ان کے ذہن دماغ پر مرقم ہو جاتے فلج کے حملہ کے بعد سے ڈاکٹروں نے ان پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی تھیں جن پر وہ محض اس وجہ سے عامل رہتے تھے کہ ڈاکٹر کا یہی حکم تھا۔ ورنہ وہ مرض کے انجام سے ڈرتے نہ تھے۔ غذا یا سہنے سہنے کے سلسلے میں جو پرہیز بتایا گیا تھا۔ اس میں عجیب لطافتیں پیدا کر لی تھیں۔ خون

کا دباؤ بے حد تھا لیکن وہ قریب قریب بھلے چنگوں کی طرح بہتے تھے ایک بار ڈاکٹر نے کہا خون کے اس دباؤ کے ہوتے ہوئے آپ کا زندہ رہنا بھی کرامات میں سے ہے۔ اصغر صاحب نے کہا بہت ممکن ہے موت اسی سے واقع ہو لیکن زندہ رہنے کے اور ہی گڑ ہیں زندہ رہنے میں ارادہ کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ ہوش میں رہ کر تو میں مردوں گھا نہیں۔ البتہ بے خبری میں آپ کا بس چلے تو موت سے پٹ لیجئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مرحوم رات کو کھانے پر دوستوں میں سے کسی کے ہاں مدعو تھے۔ سب لوگ ہنس بول رہے تھے کہ فلج کا شدید حملہ اور ایک سخت حملہ ہوا اور چند گھنٹے میں طبعی بے خبری کے عالم میں رہ کر عیشیگی میں مل گئے۔

اصغر صاحب زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گزرے تھے۔ ہر قسم کی صعوبتیں دیکھی تھیں لیکن انہوں نے خود داری اور یانہیں کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں ان کا شعاع ہونا۔ اتفاقی تھا وہ کچھ اور ہوتے تو بھی یہی رنگ قائم رہتا۔ ان کی وفات کے بعد مجھے ان کے بہت سے ملنے والوں سے سابقہ ہوا۔ ادب و باشعور، قلندر، ارباب علم و فکر صاحب باطن، ارباب دول کو اسی وبے بہرہ، طالب علم، کاروباری لوگ میں نے ہر ایک کو ان کا قائل پایا۔ ان کے دشمن بھی کم نہ تھے جنہوں نے مخالفت میں وہ

سب کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ لیکن اصغر صاحب کو گھٹیا کسی نے نہیں بتایا۔  
 اصغر صاحب کے جاننے پہچاننے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو بڑے  
 بڑے مناصب پر فائز تھے جن کی قابلیت اور شخصیت مسلم ہو وہ بھی اصغر  
 صاحب کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ مرحوم میں وہ بات نہ تھی جو ساحر و نافع  
 میں ہوتی ہو کہ ان کے سامنے رہے تو سب کچھ بعد میں کچھ نہیں مرحوم غیر  
 نہیں کرتے تھے بلکہ لوگ خود ان کی الفت و اخلاص کی منزلت کرنا عزیز  
 رکھتے تھے۔

ان میں ایک خاص نوعیت کی بڑائی تھی جس کا ہر بڑائی کو لحاظ رکھنا  
 پڑتا تھا!

جامعہ ملیہ میں ایک بار مشاعرہ تھا شعر خوانی اور شعر سرائی ہو رہی تھی  
 اصغر صاحب کی باری آئی مرحوم کی آواز طبعاً بہت تھی شعر پڑھنے شروع  
 کئے تو مجمع میں انتشار پیدا ہوا مرشد (ذاکر صاحب) پاس بیٹھے ہوئے تھے  
 یک بیک اصغر صاحب سے پرچہ لیکر اٹھ کھڑے ہوئے اور شعر سنائے شروع  
 کر دئے۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

زلا استخیر کردم این جہانے مہر و انجم را  
 ز جوش بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا  
 میں جانتا ہوں مرشد کا یہ اضطراری فعل کس از کی غمازی کر رہا تھا اور دش

کے منظر اری فعل کا کیا درجہ ہوتا ہے ان کے چند ہی منظر اری آنسوؤں نے علی گڑھ کی آبرورکھ لی اور جامعہ کو جامعہ بنا دیا اور مسلمانوں میں ایک نژاد نو کی طرح ڈالی۔

اصغر صاحب مشاعروں سے بیزار تھے لیکن کہا کرتے تھے کہ طالب علموں کی دعوت رد کرنا گناہ ہے ایک دفعہ فرمایا کہ ان میں بے راہ روی ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن یہ قصور ہمارا ہے۔ ہم میں نظر و فکر کی وہ گہرائی اور وسعت باقی نہیں رہی جو سفینہ نو کی محفل ہو سکے۔

جگر صاحب سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ وہ ان کی بڑا راہ روی سے بڑے کڑھتے تھے لیکن ان سے محبت کرتے تھے۔ جگر صاحب انتہائی خود فراموشی کے عالم میں بھی اصغر صاحب کا بڑا پاس کرتے تھے مرحوم اکثر جگر صاحب سے کہتے تھے کہ جو چاہو کرو اتنا تم کو یہیں پڑے گا۔ جگر صاحب ایسے غیور عزت پسند قانع اور سادہ مزاج شاعر کم دیکھنے میں آئے جن کو وہ اپنے نزدیک بزرگ یا بہتر سمجھتے ہیں اس کا لحاظ اس طرح کرتے ہیں جیسے زمانہ میں چھوٹے اپنے بڑوں کا کرتے تھے بایں ہمہ جگر صاحب ایسا منہ پھٹ آدمی بھی کم ملے گا۔ جاہ و شہرت سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہیں اپنی اس افتاد طبع سے بعض مواقع پر عجیب عجیب نزاکتیں پیدا کر دیں۔ اب تو خدا کے فضل سے مدتوں سے عالم ہوش میں ہیں اور پچھلی عادت



ایک قلم ترک کر دی ہیں نے ابن کو انتہائی از خود فنگی کے عالم میں دیکھا  
ہوا اور پڑے سے بڑے شاعر اور شخصیت کو سخت سست کتے سنائیں  
اصغر صاحب کا نام آتے ہی ان کو یا تو سنائے میں آتے دیکھا یا بے  
اختیار اشکبار پایا اور جگر صاحب کا اب تو یہ عالم ہے کہ وہ اصغر صاحب  
کے مخصوص انداز و اطوار میں اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں  
اور اپنی بعض بعض باتوں کو اصغر صاحب کے باطنی تصرف کا صدقہ سمجھتے ہیں  
اور اس پر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں۔

اصغر صاحب کے کلام پر ان کی زندگی ہی میں بعض ناقدین نے سخت  
تکلف چینیاں کیں۔ عروج کی نظر سے یہ سارے مضامین گزرتے تھے لیکن میں  
نے آج تک ان کی زبان سے ناقدوں کو برا بھلا کتے نہ سنا۔ اکثر کہا کرتے  
تھے کہ ناقدوں کا درجہ بہت بلند ہے بشرطیکہ وہ مخلص اور سمجھدار ہوں  
خدا کا مفسر شاعر ہے اور شاعر کا مفسر نقاد ہوتا ہے۔ یہ کڑیاں اٹھ جائیں  
تو دنیا احتمال محض ہو کر رہ جائے ایک دفعہ انھوں نے فرمایا تھا کہ لوگ  
اپنی افتاد طبع کا اقتساب کئے بغیر غزل یا غزل گو سے برہم ہونے لگتے  
ہیں۔ لوگ غزل سے بیزار ہیں۔ اس لئے کہ اس کے موضوع کو پسند نہیں کرتے  
حالانکہ اب غزل کا موضوع ہی نہیں بلکہ اس کا رنگ و آہنگ بھی بہت

کچھ بدل گیا ہی یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ برے غزلگو یوں نے کیا خرایساں پھیلائیں۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ اچھے غزلگو کتنی خوبیاں پیدا کر سکتے ہیں اور پھیلا سکتے ہیں۔

مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ میں غزل کو نہ نظر رکھتا شعر نہیں کہتا اس کو کیا کروں کہ بلند کرے نازک اور لطیف خیالات خود بخود غزل کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں کاشش میرے خیالات و احساسات کوئی دوسرا پیکر اختیار کر لیتے۔ مجھے قطعاً افسوس نہ ہوگا اگر وہ غزل نہ کہلا ئیں!

ایک دفعہ میں نے عرض کیا اصغر صاحب آپ تو جتنے اور صبیہ شعر چاہیں کہہ سکتے ہیں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ غزل میں صرف اول درجے کے اشعار تو رہتے دیا کیجئے بقیہ کو حذف کر دیا کیجئے۔ اصغر صاحب براہک جھجھری سی طاری ہوئی پہلو بدل کر بیٹھ گئے۔ فرمایا رشید صاحب آپ نے کیا بات کہی؟ آپ ایسی باتیں کرتے ہیں! شاغری دو سرے درجہ کی بات کہتا ہو؟ کہہ بھی سکتا ہے؟ وہ تو ہمیشہ اول ہی درجہ کے شعرا ہوتے ہوئے سننے والے کے نزدیک وہ اول درجہ کا ہو یا دوم درجہ کا۔ اس سے شاعر کو کیا علاقہ! آپ کے نزدیک وہ چھوٹی ہو تو ہو جب شاعر نے اُسے کہنا تو وہ بڑی ہو گئی بہت بڑی کچھ دن اور گندریں تو یہ حقیقت آپ پر خود واضح ہو جائے گی۔

انصاف صاحب کو سجا داننداری مرحوم سے بڑا لگاؤ تھا۔ کہتے تھے زندگی نے وفات کی در نہ خدا جانے کیا ہوتے رہا یا ہم میں ایسے تقاد اور مفکر کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ اردو میں خرافات نگاروں کی تعداد بہت جلد بڑھ جاتی ہو جن کا تدارک نہ کیا جائے تو ہونہاروں پر زندگی تگمات جاتی ہے۔ بت شکن تھے کچھ دن اور جئے ہوتے تو کیا معلوم توفیق الہی انہیں براہیم بنا دیتی۔

سر سپرو کا احترام کرتے تھے کہتے تھے سر سپرو کا احترام کرنے میں لطف آتا ہوا اس لئے کہ وہ احترام کی حرمت سے واقف ہیں۔ بالوں بالوں میں ایک دن فرمانے لگے کہ ان کی صحبت میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی حال میں نہ اپنی سطح سے اتریں گے نہ حاضرین میں سے کسی کو اس کی حدود سے گزرنے دیں گے۔ اردو و ہندی کے سلسلہ میں کہنے لگے کہ ہندوستان میں سر سپرو اوپنڈت کی نفی ہی ایسے ہندو ہیں جن کو اردو سے برنبائے اردو لغت ہے دونوں میں پرانے زمانہ کے مسلمان شرفا جیسی وضع دار ملتی ہے۔

اونچی جماعتوں کے مختلف انجیال طلباء اکثر ان کی صحبت میں دیکھے گئے۔ تعجب ہوتا کہ یہ نوجوان جدید ترین افکار کے حامل ہوتے ہوئے بھی کس طرح انصاف صاحب کا کلمہ پڑھتے ہیں میں نے مرحوم سے ایک دفعہ

س کی وجہ پوچھی ہوئے دنیا میں ایک ہی مستقل علم تو ہے نہیں ہر علم کے تار  
پود ایک دوسرے میں ملے ہوئے ہیں ایک ہی علم کی ٹہنیں مختلف علوم  
سے مختلف معلوموں سے ہوتی ہے پھر آپ تو جانتے ہیں کتابی اور اخباری  
علم (مسکرا کر) ”بزرگوں کے تصرف“ کا ہمیشہ محتاج رہے گا۔ جب علم  
رزاں اور معلم ایاب ہوں تو ظاہر ہے ہم آپ نظر انداز نہیں کئے جاسکتے!

اصغر صاحب مرحوم کے کلام پر گفتگو کرنے کا یہ محل نہیں لیکن میری  
شکل یہ ہے کہ ان کے کلام کو ان کی زندگی سے علیحدہ بھی نہیں کر سکتا۔ دھوم  
ماڈ کر چھڑتا ہوں تو بار بار ان کا کلام سامنے آتا ہے اور ان کے کلام کی  
ریت رجوع ہوتا ہوں تو اصغر صاحب جیتے جاگتے مسکراتے سامنے آجوتے  
ہوتے ہیں ان کے کلام کو جسم و جان میں منتقل کیجئے تو اصغر صاحب اور اصغر  
صاحب کو الفاظ و عبارت میں تحول کیجئے تو ان کا کلام۔

کلام سامنے آجانے سے مقصد ان کے اشعار کا یاد آنا نہیں ہی بلکہ وہ  
جمال و کماں اور تصورات کی وہ مینا کاری و فردوس آرائی ہے جسے  
ان کا کلام بروئے کار لاتا ہے۔ ان کا کلام انھیں کی طرح ثبت کرنا والا  
رفاقت کرنے والا اور ترغیب پیدا کرنے والا ہے۔ اصغر آپ کو فکر کی زحمت  
نہیں دیتے یہ زحمت وہ خود اٹھاتے ہیں وہ اپنے فکر کے رنگین و بے نقاب

سے آپ کی مدارات کرتے ہیں اور مدارات بھی اس طرح کرتے ہیں کہ آپ پر کسی قسم کا بار نہیں ہوتا۔ یہی بات اصغر صاحب کی زندگی میں ملتی تھی۔ اس سلسلہ میں محض انہماق تقسیم کی خاطر میں ضمناً اقبال کا بھی ذکر کر رہا ہوں۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجئے۔ حاتم طائیؓ کے کوہِ ندا کی مانند وہ اپنی پہلی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں میں ڈالیں اور آپ سے کچھ نہ پڑے گا۔ اصغر سے رجوع کیجئے وہ آپ کے ساتھ ہو لیں گے اقبال آپ کو سر مواد ہر ادھر نہ ہونے دیں گے۔ اصغر سے آپ خود علیحدہ نہ ہوں گے۔ اقبال کے ہاں موضوع فکر (تہم) اور دعوت عمل ہی اصغر کے ہاں تصورات جمیل اور دعوت دیدہ اقبال حکومت کرتے ہیں اور اصغر رفاقت کرتے ہیں۔ معنوی حیثیت سے دونوں جدا ہیں اور اپنی اپنی وادی کے امام ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کے وزن کے اہتمام (ترصیع) میں دونوں انتہائی احتیاط اور صناعت کاری کو دخل دیتے ہیں اور سلیقہ و شرافت کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔

اصغر کی زندگی ہی سلیقہ شرافت اور صداقت میں گزری۔ ظاہر ہے یہی رنگ ان کے کلام کا بھی ہو گا۔ اصغر سراسر غزل گو ہیں لیکن ان کے کلام میں غزل کی مروجہ یا مسلمہ عربانی یا خامکاری نہ ملے گی آپ ان کا کلام بے تکلف جس کے سامنے چاہیں پڑھ سکتے ہیں اور اس کا سبب یہ

ہو کہ انھوں نے الفاظ اور جذبات کو پورے طور پر ملحوظ رکھا ہی اور دونوں کو انتہائی احتیاط اور سلیقہ سے اپنے کلام میں برتا ہے۔ ان کے ہاں ترغیبات یا تجربات جنسی نہ ملیں گے بلکہ ان کی لطافتیں اور نزاکتیں ان کی رفعتیں اور ان کی ذمہ داریاں۔ ان کے ہاں تفصیل نہیں تحلیل ہے کیمیائی یا نفسیاتی تحلیل نہیں بلکہ شاعرانہ اور عارفانہ تحلیل۔ پھر وہ اس تحلیل کو الفاظ و معنی کی کیفیت و کم رنگ و آہنگ کے ایسے فانوس میں گردش دیتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے اپنے محبوب کا خود خال نظر آتا ہے۔ عارفانہ بصیرت اور شاعرانہ صناعت کاری کا معجزہ بھی یہی ہے۔

اصغر عوام کے شاعر نہیں ہیں ان کے کلام کے حسن و تاثیر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آپ تھوڑے بہت لکھے پڑھئے بھلے مانسوں میں بیٹھے اور ذوق و بصیرت رکھتے ہوں۔ شاعری نہیں دنیا کا ہر شریف فن ریاض اور رکھ رکھاؤ چاہتا ہے۔ اصغر صاحب کی شاعری اسی کا نمونہ ہے۔ اگر جدید اسکول سے پسند نہیں کرتا تو یہ اصغر صاحب کا قصور نہیں ہے۔ قصور اس مقصد اور معیار کا ہے جس کے وضع نہ مقلد نہ مداح !

---

اصغر صاحب اپنے کلام کی جنت میں ہمیشہ زندہ قائم رہیں گے !



# اٰیُوْب

تمہاری نیکیاں زندہ تمہاری خوبیاں باقی!

ایوب مرحوم کے بارے میں کیا کہوں کیونکہ کہوں اور کہاں سے شروع کروں! وہ اتنے اچھے تھے۔ اتنے ارزاں تھے اور اتنے ناگزیر تھے کہ ان کے بارے میں کچھ کہنا شروع کروں تو سب سے پہلے یہ محسوس ہوتا ہو کہ یہ نہیں وہ۔ یہاں سے نہیں وہاں سے۔ ابھی نہیں آگے چل کر۔ یوں نہیں دوں۔ وہ موجود تھے تو ان کی مثال ناعلم فطرت کی تھی۔ مثلاً ہوا پانی۔ روشنی جو اس درجہ عام و ارزاں ہیں کہ ان کی طرف توجہ مائل نہیں ہوتی۔ لیکن ان میں سے کسی میں کہیں سے کوئی ذرق آجائے تو بھر دیکھے کسی کی مشککات کا سامنا ہوتا ہے۔ اور یہی ناقابل التفات نعمتیں کسی نعمتیں بن جاتی ہیں۔

ایوب ایسے ہی تھے۔ وہ دوستوں کی زندگی میں اس طرح اور اس درجہ گھل مل گئے تھے کہ ہم سب کو ان کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ ہم سے رخصت ہو گئے تو ہم میں سے ہر ایک نے یہ محسوس کیا کہ جو چیز ناقابل التفات حد تک ارزاں و عام تھی۔ وہی ناقابل بیان حد تک اچھی ضروری اور نایاب بھی تھی۔



ہم سب کی زندگیوں میں مرحوم کے گھل مل جانے کا راز یہ تھا کہ ان میں بظاہر کوئی بات غیر معمولی نہ تھی۔ وہ غیر معمولی قابلیت کے آدمی نہ تھے۔ دو لہجہ مند نہ تھے۔ کچھ بہت ذہین بھی نہ تھے۔ نہ انھیں توڑ جوڑ آتا تھا۔ نہ خوش پوشاک۔ نہ خوش گفتار۔ نہ خوش باش۔ نہ رنگین و ریخا۔ وہ معمولی آدمیوں سے بھی زیادہ معمولی تھے پھر بھی وہ ایسے تھے کہ اب ہم میں ویسا کوئی نہیں اور نہ اب ڈھونڈھے سے بھی کوئی ایسا ملے!

سیاہ فام، چچیک روتا پست قد، نحیف الجثہ۔ پہلے پہل کوئی دیکھے تو منہ پھیر لے۔ برت لے تو غلام بن جائے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ ایوب کی خوبیوں نے ان کی بد صورتی کو کس درجہ دل آویز بنا دیا تھا فطرت اپنی چو کی بسا اوقات کسی بے دریغ بخشی سے ملائی کرتی ہے میری ہی نہیں۔ میرے عزیزوں اور دوستوں کی بھی ان سے بڑی پرانی ملاقات چلی آتی تھی۔ اور میں نہیں بتا سکتا کہ ہم سب کی زندگی میں ایوب کس قدر تحصیل تھے اور ان کی موت نے ہم سب کو کیسا ہیبت زار و مایوس۔ کس درجہ بے وسست و پاکر دیا۔ وہ میرے ہی دیار کے تھے اور ایک بڑے ہی مستند شریف۔ ذی علم اور صاحب خیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ میں علی گڑھ میں تھرڈ ایر میں تھا۔ جب ایوب فرسٹ ایر میں داخل ہوئے۔ بی بی لے ایل ایل بی ہو کر پروفیسر آفس میں ملازمت کر لی اور علی گڑھ ہی میں رہ لیں۔

اسکول کی تعلیم کے دوران میں وہ میرے عزیزوں و خور و دوں کے سبق  
تھے علی گڑھ میں آئے تو ہم سب ایک ہو گئے۔ اور سترہ اٹھارہ سال  
تک ہر سچ و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔ یہ تو تھے  
میرے ذاتی تعلقات۔ اسی قسم اور اسی درجہ کے تعلقات مرحوم کے  
اوروں سے بھی تھے اور سب جانتے ہیں کہ ان کی جدائی کا ہوا لم بجھے  
ہو اس سے کم دوسروں کو نہیں ہے! خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اس پیکر  
حقیر میں دلسوزی و خود پساری کا کیسا بیکراں و بیش قیمت خزانہ ودیعت تھا  
مجھ پر، میرے بچوں پر، میرے دوستوں پر اور میرے خاندان پر  
جان چھڑکتے تھے۔ خوشی کی بات ہو تو ایوب صاحب سب سے پہلے  
موجود اور سب سے زیادہ خوش۔ سچ و تردد کا موقع ہو تو سب سے  
پہلے حاضر بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے یا ہر شخص  
کی خوشامد کر رہے ہیں۔ خوشی میں ہر طرح کے جملے رفتے سر کر رہے ہیں  
اور اپنی مسرت کا طرح طرح سے اظہار کر رہے ہیں۔ سچ و مایوسی کا موقع  
ہو تو ایک حرف زبان پر نہیں۔ نہ تسکین کا نہ تقویت کا چپ چاپ بیٹھے  
سرایا کا جائزہ لے رہے ہیں۔ یا محبت و ہمدردی سے بے اختیار ہو ہو کر  
منہ تک رہے ہیں۔ ذرا بھی احتمال ہوا کہ کسی کا آنا یا کسی معاملہ میں میرا دخل  
میرے لئے تکلیف دہ ہو گا۔ تو اسے پہلے ہی سے بھانپ کر کسی نہ کسی طرح

اس کا سید باب کر دینا اور اس طرح کرنا کہ مجھے اس کی کانوں کان خبر نہ ہو  
 میں اور میرے دوستوں کا یہ حال تھا کہ ہاتھ پاؤں ہلاتا نہ ہو اور یوں  
 سب کام کر دیں بہت سی باتیں ایسی ہوئی تھیں جن کی تمام تر ذمہ داری  
 ہمیں پر ہوتی تھی لیکن اس سے بذات خود عہدہ برآ ہونے کے بجائے یا  
 اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو تو ہم سب ایوب صاحب ہی پر پڑتے تھے  
 اور بہانے نکال نکال کر انہیں سخت سست کتے تھے۔ ایوب صاحب  
 معمولی بلکھی شیر دانی پہنے۔ ٹوٹا پٹوٹا جوتا۔ میلہ سا منظر گلے میں، پیٹے جلدی  
 جلدی چلے آ رہے ہیں۔ ہائے ان کا وہ چھوٹا سا قد۔ مشکل سے پانچ فٹ کا  
 مشغول و منہمک، منظر جلد جلد کھولتے پلٹتے راستہ میں ہر ایک سے کچھ کہتے  
 کچھ سنتے۔ گرتے پڑتے چلے آ رہے ہیں۔ ابھی فاصلہ ہی نہیں کہ جس شخص کے  
 پاس آ رہی ہیں اس نے صلواتیں سنانی شروع کر دیں۔ آپہنچے تو سخت  
 سست کی بوچھاڑ، ایوب صاحب ہیں کہ نادم ہیں۔ بہتے جا رہے ہیں۔  
 معذرت کر رہے ہیں۔ دو چار صلواتیں خود بھی سنا دیں۔ غرض دو چار منٹ  
 کے بعد اطمینان ہوا تو ٹھکانے کی باتیں ہونے لگیں۔ وعدہ کیا کہ کام کرینگے  
 نہ کریں تو جو چاہے کر ڈالئے۔ چلنے لگے تو پھر کام کی تاکید کی گئی۔ پان سات  
 صلواتیں سنا دی گئیں اور اتنی ہی سُن لی گئیں۔  
 ایوب صاحب کا گھریارہ جینے تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ بنا رہا تھا۔

ہر طرح کے لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بالخصوص اعزاء اور دوستوں کے  
 لڑکے مجھے یقین ہے اور میں بلا خوف نزدیکہ کہہ سکتا ہوں کہ ایوب صاحب  
 کے گھر میں قیام کر کے۔ اُن کے خرچ سے اُن کی توجہ و محنت سے داران  
 کے بل براعزاء اور اجاب کے جتنے لڑکوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی  
 ہوگی۔ اتنا اب تک کسی اور شخص سے نہ اب تک ہوا اور نہ شاید آئندہ ہو۔  
 ان کے گھر میں طالب علموں کا وہ ہجوم کہ اندر جا کر دم گھٹنے لگتا  
 تھا۔ ہر شخص کو کھانا پانا، سامان دینا۔ ان کی ضرورتوں کو نظر میں رکھنا  
 اور ان کی فکر کرنا۔ اس کے بعد آفس کا کام۔ دوستوں کا کام۔ غرض  
 اس شخص کی مشغولیتیں دیکھ کر ہم سب تعجب کیا کرتے تھے کہ یہ شخص زندہ  
 کیسے ہے اور اس کے حواس کیونکر بچا ہیں۔

اس کا اندازہ آپ یوں کرہ سکتے ہیں کہ ایوب صاحب نے شاید  
 ہی کبھی اپنے گھر کھا کھایا ہو۔ یا دو روز مسلسل اپنے گھر سوئے ہوں جہاں  
 نیا وہیں کھالیا اور ہو سکا تو وہیں رات بھر کے لئے پڑ رہے چار پائی بستر  
 میسر آئے یا نہ آئے۔ آرام کر سی پر سو رہے۔ مین بریٹنگ کے ور نہ کچھ لپیٹ کر  
 فرش پر ہی ایک طرف سکڑ سکڑا کر رات بسر کر دی۔ مشکل سے ایک آدھ  
 چاقی اور تھوڑا سا سالن کھاتے تھے۔ اتنا کم کھانے والا بھی شاید ہی کہیں  
 ملے کبھی کبھی ایک آدھ پیالی چائے پر ہی اکتفا کر لیتے تھے۔

سگرٹ اور حقہ کے زیادہ شائق تھے۔ بڑی سگرٹ۔ سگار حقہ جو ملجائے  
 ان کے لئے کفایت کرتا تھا۔ دوستوں میں سے کوئی بیمار پڑا اور یہاں موجود  
 ہوئے۔ رات دن کا مسلسل قیام۔ پاؤں دبا رہے ہیں۔ سر میں تیل ڈال  
 رہے ہیں۔ دو الارہے ہیں۔ کھانا تیار کر رہے ہیں اور قبول ہم پورب والو  
 کے اس کا گوشت کر رہے ہیں۔ بیماری میں آدمی چڑچڑا ہوا جاتا ہے۔ چنانچہ  
 اس کی ہر قسم کی زیادتیاں بھی سہہ رہے ہیں۔ بیمار اچھا ہوا تو شکر سے  
 بھی سخت مست ہی کلمات کہے۔ ایوب صاحب ہیں کہ خوش ہیں لیکن  
 یہ یاد رہی کہ ایوب صاحب کو جو لوگ حملواتیں سناتے تھے وہ سب ایوب  
 صاحب کے گردیدہ احسان ہو کر۔ شعرا اور بے فکر دوں نے لطف و شکر کے  
 جتنے الفاظ وضع کر رکھے ہیں۔ وہ سب اُن گالیوں کے سامنے پہنچ تھے جو  
 سب ایوب کو دیتے تھے اور ان سے سنتے تھے!

ایک دفعہ بمبئی بچے مکان گئے، میں اور دو بچیاں رہ گئیں۔ دو  
 ایک بیک چلا گیا۔ برسات کا موسم تھا۔ میں دن بھر ادھر ادھر مارا مارا پھ  
 تھا۔ کوئی ۵-۶ بجے شام گھر واپس ہوا۔ دیکھا تو ہر چیز قرینہ سے مکالمہ  
 لگی ہوئی ہو۔ بچیاں صحن میں آم کھا رہی ہیں۔ ذرا ہی دیر میں ایوب صاحب  
 آنکھ ملے۔ راگھو میں لت پت باورچی خانے سے ڈانٹ کر بے جی پھڑ  
 اڑائے۔ لکڑیاں بھیگی ہوئی ہیں۔ چولہا ٹوٹا ہوا ہے۔ میں نے کہا کیا ہوا

سخت و سست الفاظ کے بعد آخر ڈانٹ کا لال کو کیا ہوا تھا وہ اس سے انتظام کر لیا ہوتا۔ بولے۔ جی شام کے ۵۔ ۶ بجے آپ کے لئے ڈانٹ ہال سے باقر خانیہاں نہ آجائیں۔ بچیاں کیا کرتیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آفس سے براہ راست شہر گئے وہاں سے بچیوں کے لئے آم اور پکوانے کے لئے کچھ ساگ ترکاری لائے۔ بچیوں کو آم میں پھنسا کر خود باورچی خانہ میں بل پڑے۔ ترکاری ساگ اور کچھ اسی قسم کی چیزوں سے ابھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔ بھئی ایوب خدا کے لئے کچھ تو ٹھکانے کی چیز کھا پانی لیا کرو۔ ورنہ انہیں بھیک مٹکے لگیں گی۔ بولے جناب نے بھی تو متجن ہی کھا کھا کر علیحدہ کے نمبر پر رکھائے ہیں!

کھانا پینا ہو چکا تو آم نکالے۔ میرے سامنے تو قلمی اور لنگڑے رکھے اور خود چوسنے والے آم لئے۔ میں نے کہا یہ کیا۔ یہ آم کیوں نہیں لیتے۔ کہنے لگے یہ آپ ہی کو مبارک ہوں مجھے تو چوسنے والے ہی پسند ہیں میں نے کہا چوسنے والے اپنے گھر کھائیے گا۔ میرے ہاں اس قسم کی قومی حرکت کرو گے تو مجھ سے برا کوئی نہیں۔ کھانا پینا ختم ہوا تو اپنی کھڑی چارپائی بچیوں کی چارپائی کے درمیان بچھا کر لیٹ رہے اور اُن سے انہیں کے دھبسی کی ادھر ادھر کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ جب وہ سو گئیں تو سر سے پاؤں تک مکمل تان کر خاموش ہو گئے۔ میں نے دیکھا تو کہا۔ ایوب تم اس گھر سے نکلو۔

اس سڑی گرمی ہیں کھل اور بھ کر پرا نہ میں سوؤ گے تو ظاہر ہے۔ تمام رات میں صحن کے اس چبوترہ پر رقص کر دوں گا۔ کیا فائدہ صبح میں پاگل حسانہ پہنچایا جاؤں اور تم قبرستان۔ نہ مانے اور اسی طرح سوئے۔ ان کا یہی معمول تھا۔

صبح جیتے جاگتے اٹھ بیٹھے اور دن کے دھندلے مہینے لگنے علی گڑھ میں داخلہ کا زمانہ بڑے ہنگامے کا ہوتا ہے۔ سارے بزرگانِ قوم جو سال بھر ہم سب کو گالی اور اخبارات کو پیام بھیجتے رہتے ہیں۔ نئے سیشن کے شروع ہوتے ہی ہم کو فردینِ اولیٰ کا مسلمان قرار دیدیتے ہیں پہلے خطوط آنے شروع ہوں گے۔ اس کے بعد اس کے بعد مانگے۔ "فصلہ فریاد" ایک ہی ہوتی ہے۔ یعنی لڑکا آپ کا ہے۔ یونیورسٹی قوم کی ہے۔ اور حکومت ہندوؤں کی۔ لڑکے کو داخل کرائیے جتنی مراعات ہو سکیں دلوایئے۔ بقیہ خود پوری کیجئے۔ چال چلن اور خواندگی کی نگرانی کیجئے۔ پاس کرائیئے۔ نوکری دلوایئے۔ اور ہم دونوں کو اس وقت تک جمان رکھئے۔ جب تک کہ لڑکا یہاں کے ماحول سے آشنا اور خود اُن سے متفرق نہ ہو جائے۔ اچھ اور تیرتھ کے بارہ میں تو یہ طریقہ ہے کہ ملکوں کے مختلف حلقے مطوف اور پنڈتوں نے بانٹ لئے ہیں۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں یہ آپ کی جان و مال کے ذمہ دارا خدائی قویٰ ہیں۔ جان کے

کم۔ ماں کے زیادہ۔ علی گڑھ کا دستور اس سے بالکل مختلف ہے۔ جس کا جی چاہے جس جس مطوف یا پٹے کے ہاں ٹھہر جائے یا اور اس کی جان و مال کا انچارج بن جائے۔ داخلہ کا زمانہ عین برسات کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہی۔ برسات۔ ہمانداری اور قوم کی فتنہ خوانی کا بیک وقت زور ہوا اور کام کوئی نہ ہو تو وعدہ کب تک ساتھ دے گا۔ والدین میں سے کوئی بچیش میں مبتلا ہے۔ کوئی اس سال میں کسی کو یونانی علاج موافق نہیں آتا۔ کسی کو ڈاکٹری دوائے اصولاً اختلاف ہے۔ کھانا ماضی سب کو موافق حکیم صاحب کے ہاں لیجائے یا انہیں بلائے تو بتائیں گے موجود

لے یہ نقطہ لغوی معنوں میں نہیں استعمال ہوا جو یہ علی گڑھ میں ترک موالات کے زمانہ کی یاد گار ہے۔ جب ہر لڑکے کا کوئی نہ کوئی بزرگ اپنے لڑکے کو سمجھانے سنبھالنے علی گڑھ آیا تھا اس زمانہ میں طرح طرح کے بزرگوں کی اتنی کثرت ہو گئی تھی کہ لوگ گھبرائے تھے۔ چنانچہ اب جس لڑکے کے ساتھ کسی غیر معمولی لیکن چالیس سال سے زائد عمر کے بزرگ کو کوئی دیکھ لیتا ہے فوراً کہہ پڑتا ہے۔ ”فہو الولدین“ یہاں تک کہ اگر کسی لڑکے کے ساتھ گھر کا کوئی پرانا نوکر بھی آئے تو لوگ کہیں گے فلاں صاحب کے ساتھ ”ایک والدین“ بھی ہوا ایک والدین کا فقرہ علی گڑھ میں قطعاً موزوں سمجھا جاتا ہو مثلاً میں فلاں جاگہ جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک والدین ملے چنانچہ علی گڑھ کی والدین کے معنی خواہ مخواہ ماں باپ کے نہیں ہیں بلکہ کوئی بزرگ عاصورت کا بیوی جیسی عالم سے وابستہ نظر آجائے۔ والدین ہے۔



شرکایت اور علاج کرائیں گی۔ دیرینہ شکایات کا!  
 اس زمانہ میں اور ایسے مواقع پر ایوب مرحوم کام آتے تھے کسی کے  
 لئے چارپائی کی ضرورت ہے۔ تو وہ لارہے ہیں۔ کسی کے پاس سارٹیفکٹ  
 نہیں ہے اس کی سہیل نکال رہے ہیں۔ کسی کو مخصوص بورڈنگ ہاؤس میں جگہ  
 نہیں مل رہی تو اس کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ کسی کے پاس پٹے  
 نہیں ہیں تو ادائیگی بالاقساط کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی کے پاس کتاب  
 یا فریج نہیں ہے تو اس کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کوئی اسٹریچی ہال کے مختبرستان  
 میں کھو گیا ہے تو اسے راستہ پر لگاتے ہیں۔ والدین یا سرپرستوں کے  
 لئے حقہ پارلے اُردو نادوں کی ضرورت ہے تو اسے فراہم کر رہے ہیں۔  
 اور سب کچھ ہو گیا تو اشارہ کنایہ سے، حیلہ حوالہ سے۔ خوشامد کر کے  
 روپیٹ کر بھجلا کر آمادہ قتل یا خودکشی ہو کر یہ مہمان کو میزبان کا گھر چھوڑنے اور  
 اپنے اپنے ٹھکانے پہنچنے کا مرحلہ طے کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ہی جگہ نہیں  
 ہو رہا ہے۔ میرے گھر آپ کے گھر۔ دوستوں کے گھر۔ اور خدا جانے اور کہاں  
 کہاں یہی ڈراما ہو رہا ہے۔ ایوب صاحب ہیں کہ اپنے فرائض اور اپنی مصیبتوں  
 کو نظر انداز کر کے دوستوں اور دوسروں کی مصیبت میں شریک ہیں۔ میزبان  
 مہمانوں سے تو کچھ بولتا نہیں لیکن آخر غم و غصہ نکالنے کا کوئی موقع تو ہوا  
 اس کے لئے ایوب صاحب تھے۔ انہیں بلا یا گیا۔ یہ پہنچے تو کچھ متردد ہوئے۔

کچھ نادام اور کبھی کبھی تالی بجا کر قفقہ لگانے لگے پھر بولے معلوم ہوتا ہی کوئی اور آیا یا کسی اور کو دست آئے۔ رشید صاحب واللہ خوب ہوا بڑا مرزہ آرہا ہی اور کھئے مرزا جیہ مضمون۔

ایوب مرحوم کو برج کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ ان کی زندگی میں اور کچھ انہیں کی وجہ سے ہم لوگ بھی اس کے بڑے شائق ہو گئے تھے بازی نہیں لگائی جاتی تھی۔ اس لئے کہ ہم ہیں ایک سے ایک انارٹھی کھیلنے والا تھا جتنا کھیلتے تھے۔ اتنا ہی تنزل کرتے تھے۔ پھر ایک دوسرے کو خواہ وہ جیتے یا ہارے سخت سُست اتنا کہہ لیتے تھے کہ کسی اور بدل کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں ہر کین کا لفظ اخبارات میں آیا تھا۔ بے تکلف صحبتوں میں ایوب مرحوم کا یہی نام رکھ دیا گیا تھا مرحوم بھی کچھ کم نہ تھے ہم سب کو بھی وہ ایسے ایسے ناموں سے پکارتے تھے کہ ہمارا ہی دل جانتا

سہ ایک دن میں اور ایوب مرحوم بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ ایک نہایت دیندار و جہنی بزرگ آئے شکل سے کچھ قومی کچھ علمی اور تھوڑے بہت مرزا یافتہ معلوم ہوتے تھے اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے حرف مطلب زبان پر لائے یہ بھی سوچا تو اور باتیں شروع کریں۔ ایوب صاحب پر رعب پڑ رہا تھا۔ بار بار سگریٹ پیش کرتے اور سر ہلاتے جاتے تھے بزرگ رخصت ہونے لگے تو بولے رشید صاحب آپ جیسا مرزا جیہ مضمون کہنے والا کوئی اور نہیں! ایوب صاحب اٹھ کر کمرہ میں بھاگے۔ جب اجنبی بزرگ جا چکے تو یہ برآمد ہوئے ہستے ہستے لے جاتے تھے اور بار بار کہتے تھے اور کھئے مرزا جیہ مضمون!!

ہو۔ ان کے بغیر تاش کی صحبتیں بالکل بے کیف ہوتی تھیں بعض دفعہ یہ ہوا  
 ہو کہ ایوب مرحوم کھیل میں موجود نہ ہوئے تھوڑی ہی دیر میں سب نے تاش  
 چھینک دی تھی کہ بغیر تاش کے کوئی لطف نہیں۔ رات کافی گزر چکی ہو۔ ڈاکٹر  
 عباد الرحمن خاں کی موٹر پر جم سب ان کی تماش میں نکلے۔ بڑی دُور دھوپ  
 کے بعد کسی دوست کے ہاں ملے اپنے گھر چوکہ رہتے ہی نہ تھے۔ اس لئے  
 وہاں ہم سب کبھی نہ گئے۔ دوست کے ہاں بھی رونق محفل وہی تھی۔ اس لئے  
 وہ لوگ بھی مارنے مرنے پر تیار ہوئے کہ ایوب کو جانے نہ دیں گے۔ بڑی  
 بڑی خوشامدوں سے یا لڑا جھگڑا کر انہیں لائے اور محفل پھر سے جمی۔

تاش کے شائق اتنے تھے لیکن براہ راست کبھی نہیں کہتے تھے کہ چلے  
 تاش کھیل جائے۔ آئے اور بیٹھ گئے۔ ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں۔ غیب  
 سمجھتا تھا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ اس لئے عمدہ غیر متعلق باتیں چھیڑتا  
 رہا۔ یہ ہمارے وار خالی دیتے رہے۔ آخر کاریں نے کہا۔ ایوب صاحب تم کو تو  
 تاش کا ہیضہ ہے۔ نہایت سنجیدگی سے بولے۔ جی ہاں۔ آپ لوگوں کو تو تاش  
 چھینک بھی نہیں آتی۔

میں تیار ہوا۔ دونوں ڈاکٹر اصغر کے ہاں پہنچے۔ ہم خوب سمجھتے تھے کہ  
 یہاں کیا پیش آئے گا۔ ایوب مرحوم کو دیکھتے ہی لٹکارا۔ ہر سچن دروازہ کے  
 اندر قدم نہ رکھنا۔ مرحوم بولے بس بس جناب ڈاکٹر صاحب بہت زور

باندھے۔ دروازہ کے اندر سے خود تو کبھی قدم باہر نکالنے کی ہمت نہیں ہوتی اور بھبکی یہ دیکھتے۔ داستان میں ڈاکٹر عباد الرحمن خاں بھی آگئے تھے (مغزین شہر تشریف لائے ہیں۔ اصغر صاحب بوئے لعنت ہے مغزین شہر پر اور آپ پر اسی سانس میں نوکر کو آزادی میسر نہ کیا واپاندان لے چلو۔ ایوب مرحوم سے مخاطب ہو کر بولے۔ کیوں جی باورچی تلاش کیا۔ مرحوم بوئے بھیجا تو تھا۔ آپ کو ملا نہیں؟ بوئے لعنت ہے۔ باورچی بھیجا تھا یا بھنگی۔ اپنی ہی شکل کا ڈھونڈتے ہو۔ مرحوم نے نہایت سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔ ڈاکٹر صاحب کیا کروں۔ آپ کی شکل والا تو یونیورسٹی والے نہیں چھوڑتے کیا کیا جائے۔ ایوب صاحب کی سیرت و شخصیت کا عجیب اور نادر پہلو یہ تھا کہ بڑے سے بڑا آدمی ہو یا چھوٹے سے چھوٹا ان سے عزت آمیز محبت کرتا تھا۔ ترس لگا کر یا مجبور ہو کر نہیں بلکہ ان سے محبت کرنے میں اُسے لطف آتا تھا۔ ایوب سے محبت کر کے جیسے دل کو تسکین ہو جاتی تھی۔ ایک طرح کی پرافتخار اور طمینان بخش تسکین۔ جیسے یہ احساس کہ ہم میں بھلائی کرنے یا بلند ہونے کا جذبہ یا استعداد ہی۔ محبت کی ایک قسم دہ بھی ہوتی ہے جو اپنے سے حقیر یا بہت حال سے کی جاتی ہے۔ جیسے لوگ اپنے کُتے سے کرتے ہیں یعنی اُسے سمجھتے کہ وہ ہی ہیں۔ لیکن جو متے چمکارتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی محبت بالعموم بڑے آدمی چھوٹے سے کرتے ہیں لیکن سخت مشغوری ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ محبت

یا اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے اعتبار سے تو لوگ انہیں انسان سمجھیں۔ لیکن خود ان کے جذبہ فرعونیت کی تسکین ہو یعنی ہم ایسے ہیں کہ ترس کھا کر اپنے بندے سے محبت کرتے ہیں اور اس طور پر اس کی زندگی میں امید فخر کی ہلکی سی لہر دوڑا کر ہچکچاہٹوں میں بیٹھنے اور سر بلند ہونے کے قابل بنا دیتے ہیں اس طرح کی محبت یا عزت ایوب صاحب سے کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

ایوب صاحب وہ تھے جن کے لئے ہر شخص اپنی عزت یا شہرت کو داؤ پر لگا دینے کے لئے بے تامل تیار ہو سکتا تھا۔

ایوب سے محبت نہ کیجئے یا ان کی عزت نہ کیجئے تو یہ محسوس ہوتا کہ ہم ہیں شریفانہ جذبات یا ذمہ داری کی کمی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مد نظر رکھئے کہ ایوب صاحب کے دل میں یہ بات کبھی گزری ہی نہیں کہ ان کی خدمات کا صلہ مل رہا ہے یا نہیں۔ معاوضہ کا احساس شاید ان میں پیدا ہی نہیں کیا گیا تھا۔ بڑے چھوٹے کی خدمت یکساں لطف و تندہی سے کرتے تھے۔ پرووسٹ کے دفتر میں سب سے اہم عہدہ پر ہونے کے سبب ان کا سابقہ طلباء۔ اساتذہ۔ بیرا۔ باورچی۔ نانی۔ چیرا۔ سی۔ بھنگی۔ بھشتی۔ سی۔ سے براہ راست پڑتا تھا۔ طلباء کو خوش اور مطمئن رکھنا معمولی بات نہیں ہے ان کا ایوب صاحب سے طرح طرح سے سابقہ پڑتا تھا۔ وہ ہر طالب کے خاندانی حالات و معاملات سے واقف رہتے تھے۔ اور اسی اعتبار

ان سے سلوک کرتے تھے۔ اس لئے ہر طالب علم ان کو اپنے گھر کے بزرگ اور خیر اندیش کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ یونیورسٹی میں اسٹرانگ ہی۔ لڑکے ہیں کہ بے قابو ہوئے جاتے ہیں۔ لیکن ایوب صاحب کا جادو برابر کام کر رہا ہی۔ ایسے زمانہ میں ان کا طرز عمل لڑکوں سے دہی ہوتا جو میدان جنگ میں صلیب احمر کا ہوتا ہی۔

ادنیٰ درجہ کے ملازمین سے ان کا سلوک مساوات و پھر دی کا ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ ایوب کو اپنا افسر نہیں بلکہ رفیق سمجھتے تھے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ بہشتیوں کی کانفرنس کی صدارت کر رہے ہیں۔ اور جیسا کہ ایسی کانفرنسوں میں ہوتا ہی۔ ہر بستی آپے سے باہر تھا۔ ایوب صاحب جلدی جلدی سگریٹ پیتے اور بار بار پاجامہ اونچا کرتے جاتے تھے۔ ہر ایک سے مخاطب ہوتے تھے کبھی خود جامہ سے باہر ہو جاتے اور کبھی نہایت متانت سے سمجھانے لگتے۔ میں اُدھر سے نکلا تو کچھ سرٹ پیائے اور شرمائے۔ میں نے کہا واللہ ایوب آج تو بیچا نسا دشوار ہو گیا۔ جا کر مولانا سے کہوں گا کہ نوح کا پس بدوں میں بیٹھتے بیٹھتے بہشتیوں میں بیٹھنے لگا ہی۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر بڑے زور سے ہنسنے۔ کہنے لگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ذرا بیٹھ جائے۔

۱۵ مولانا ابوبکر محمد رشید فاروقی صاحب قبلہ ناظم وینات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایوب صاحب کے عزیز قریب و نزدیک۔

واللہ بڑا مزہ آئے گا۔ میں نے کہا جی نہیں آپ کو کیا آج یہ ہے کل ہنگیوں کی کانفرنس کی صدارت کرنے لگیں گے۔ فرمایا ہرج کیا پانی اور خاں کا انتظام تو کہیں کیا نہیں۔

غرض میں چلا آیا۔ ایوب صاحب بھی صدارت سے فارغ ہو کر تاش کھیلنے کے وقت پہنچ گئے۔

ایوب صاحب یونیورسٹی کے معاملات یا الجھنوں سے ہمیشہ علیحدہ رہتے اور حتی المقدور اپنے دوستوں کو بھی علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس قسم کے مسائل پر انہوں نے مجھ سے کبھی گفتگو نہ کی۔ کبھی فرصت ہوئی اور یقین ہوا کہ میں گھبراؤنگا نہیں تو وہ اپنے خاندانی قضیوں کا تذکرہ چھیڑتے اور جو کچھ دل میں ہوتا بیان کر دیتے۔ میں ان کی الجھنوں کو ہمدردی اور توجہ سے سننا تو ایسا محسوس کرتے جیسے ان کا جی ہلکا ہو گیا اور ان کے دکھ درد کا مداوا ہو گیا۔ وہ اپنے رشتہ داروں سے کچھ بہت زیادہ راضی نہ تھے سب کے سب ایوب صاحب کی شرافت اور کشادہ دلی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے درپے رہتے تھے، اس کا انہیں غم تھا اور غم غلط ہی کرنے وہ میرے پاس آیا کرتے تھے۔ ایک دن بہت ادا اس تھے آئے تو میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان کا جی ہل جائے معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ یک بیک آبدیدہ ہو گئے میں نے پوچھا تو بڑے تامل کے بعد واقعہ سنایا۔ وہی عزیزوں کی دیانت اور شقاوت کا۔

میں نے کہا۔ ایوب صاحب آپ بد دل ہوں۔ آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔  
 قصور ہی تو صرف اتنا کہ آپ خوشحال اور نیک نام کیوں ہیں میرا خیال ہے کہ  
 بیشتر ہندوستانی اعزاس کے دلوں سے نیکی اور فیاضی اٹھالی گئی ہے۔ اغیار کو تو یہ  
 مسرور اور با فراغت دیکھ کر خوش ہونگے اور فخر کریں گے۔ لیکن اپنوں کو کھاتا  
 پیتا یا ہنستا بولتا دیکھ کر غم و غصہ کے انکاروں پر لوٹنے لگیں گے۔ یہ اپنے بچے  
 پن اور بے غیرتی کو اپنی بہت بڑی خوبی اور اپنا بہت بڑا اجر یہ سمجھتے ہیں۔  
 یہ اپنے کھاتے کھاتے عزیز کو غاصب سمجھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے ان  
 تمام نعمتوں پر قبضہ مخالفانہ کر رکھا ہے۔ جو بصورت دیگر ان کے قبضہ میں ہیں۔  
 وہ کبھی نہ دیکھیں گے کہ وہ خود کتنے ناکارہ اور بے ایمان ہیں اور جو فراغت  
 ناموری اور نیکی نامی سے رہ رہا ہے۔ اس نے کتنی محنت کی ہے۔ اور لذت اٹھائی ہے  
 میں نے تو آج تک اپنے کسی عزیز کو ایسا نہ دیکھا۔ جس میں محنت اور ایمان داری  
 کی استعداد ہوتی اور وہ اپنے کسی عزیز کی فراغت و مسرت پر کڑھتا۔ کڑھتے  
 میں نے انہیں کو پایا جو غایت درجہ کے بچے اور بے ایمان ہوتے ہیں۔  
 اور یہ کہ ہمارے بیشتر رشتہ داروں ہی کا حال نہیں ہے۔ بلکہ اس انفرادی  
 کمزوری اور کمزوری نے پھیل کر جماعتی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ جماعتی ہی نہیں بلکہ  
 قومی اور سیاسی بھی۔ سرمایہ و مزدور کی جنگ اپنی جگہ سچ ہے۔ بجا نہیں ہے اور جہاں تک  
 اس کے اخلاقی و اقتصادی پہلوؤں کا تعلق ہے۔ اس کے معقول ہونے میں



شبہ بھی نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اس اسکیم کو چلانے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے درپے بیشتر وہی لوگ ہیں جو مکے، بر خود غلط او رکینہ پر ورہیں۔ دنیا کے کسی آشوب کا معاملہ کیجئے آپ کو بالآخر یہی نظر آئے گا کہ معقول نظام یا تحریک نامعقولوں کے ہاتھ میں تھی۔ آپ ہی سوچئے کیا مزدور اور کاریگر کے علاوہ کوئی اور طبقہ اس دنیا میں قابل عزت و لحاظ نہیں ہے اور کیا مزدور کاریگروں ہی سے وابستہ ہے؟ دنیا کی نجات و دولت کی مساوی تقسیم پر نہیں ہے بلکہ محنت اور قابلیت کے صحیح احساس و تنظیم پر ہے۔ میں آج کل یازیدوں کے اصولی تقسیم کا بالکل قائل نہیں جس سے ”دولت“ ان کے ہاتھ میں جائے اور مساوی میرے ہاتھ میں آئے!

آخر میں میں نے ان سے کہا۔ ایوب صاحب اپنا کام کئے جائیے۔ دولت و شہرت کا حساب عزیزوں کو نہیں اللہ تعالیٰ کو دیا جائے گا۔ البتہ آپ اس کے لئے تیار رہئے کہ جتنا اللہ آپ کو کار گزار۔ فارغ البال نیکیاں اور بھلا مانس بنائے گا۔ اتنا ہی شیطن آپ کی دشمن بنتی جائے گی۔

مرحوم اپنے جن بزرگوں یا دوستوں کو عزیز رکھتے تھے انہیں میسے ہاں ضرور لاتے اور مجھ سے ملا کر بہت خوش ہوتے۔ پھر طرا اصرار کرتے کہ میں ان کے گھرا جائے قیام پر جا کر مل آؤں یہی نہیں بلکہ جس کسی کو تکلیف یا مصیبت میں دیکھتے یا اس کے ہاں خوشی کی بات ہوتی تو مجھے مجبور کرتے

کہ میں وہاں ہواؤں۔ میں ایسا کر دیتا تو ان پر مسرت و شکر گزاری کا عجیب عالم طاری ہوتا۔ ظاہر ہی۔ اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ میری اس بھلمساہمت کی لوگ قدر کریں۔ یہ بات ہمیں نہیں ختم ہو جاتی۔ واقعہ یہ ہے کہ جس شخص یا جس بات سے انہیں تقویت یا مسرت پہنچتی تھی اس میں وہ مجھے بھی شریک کر لینا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ میں نے ان کے انتخاب کو پسند کر لیا تو اس پر اسناد کی مہر لگ گئی۔ تیسرے یہ کہ انہوں نے جس کو مجھے ملایا اس کے ساتھ بہت بڑا سلوک یہ کیا کہ مجھے ایسے (برعہم خود) معقول آدمی سے اسے متعارف کیا۔ بظاہر یہ باتیں دور از کار اور خود میرے بر خود غلط ہونے پر دال ہیں اور اپنے منہ سے ان کا تذکرہ کرنا میرے لئے بڑی بھجادی بات لیکن میں مرحوم کی بعض سخت شوری سرگرمیوں سے واقف تھا۔ ان کا مقصد وہی تھا جو میں نے بیان کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ سنئے۔ ایک دن مجھ سے بڑے اصرار سے کہنے لگے کہ رشید صاحب پتلون پہنا کیجئے۔ میں نے کہا آخر کیوں۔ کہنے لگے ہرج ہی کیا ہے۔ میں نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ آخر اس فرمائش کی تک کیا ہے۔ کہنے لگے جی چاہئے میں تک کو کیا دخل میرے انکے ایک بے تکلف دوست بھی ٹیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ رد و قدح سنی تو معاملہ کی نوعیت دریافت کرنے لگے۔ میں نے بتایا تو اچھل پڑے کہنے لگے رشید صاحب قیامت

تک نہ پہنچ سکے گا۔ اس نے ایک پتلون سلوائی ہو۔ اُسے پہننا چاہتا ہے۔ آپ سے ڈرتا ہے۔ اس کی باتوں میں نہ آئیے گا۔ دیکھوں تو کس طرح پہنتا ہے! یونیورسٹی سے ایک قطعہ زمین مکان بنانے کے لئے میں نے پٹہ پر لی تھی۔ مرحوم کا مسلسل اصرار رہا کہ رشید صاحب مکان بنوا لیجئے بہر شخص بنوا رہا ہے آخر آپ کیوں نہ بنوائیں۔ پتھوڑا سا حصہ چھوڑ دیجئے گا۔ اس میں ایک جھونپڑا ڈال لوں گا۔ مولیشی پالوں گا۔ مرغیاں رکھوں گا۔ اور کھیتی کیا کریں گے۔ میں نے کہا۔ میں مکان نہ بنواؤں گا۔ ساری زمین آپ کی جو چاہے کیجئے۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ آپ سے کچھ ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ کہنے لگے جی نہیں آپ مکان بنوائیے میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ آپ کا مکان ہو۔ آپ تمام روپیہ خرافات میں اٹھاتے ہیں۔ مکان ہو گا تو ایک چمیر ہو جائیگی۔ آپ قریب ہو جائیں گے وسیع عالی شان مکان۔ میں سمجھوں گا میرا ہی مکان ہے۔ جب چلا جایا کر فنگا ایک ٹھکانا ہو جائے گا۔

مکان بنا لیکن ایوب کا ارمان پورا نہ ہوا۔ اب وہ اور ان کا ارمان دونوں یونیورسٹی کے گورستان میں آسودہ راحت ہیں۔ یہاں پنخ کر مجھے بے اختیار اپنا چھوٹا چچا زاد بھائی جو انٹرگ رفیق یاد آ گیا۔ جس نے بارہ ہزار سال تک مرتے دم تک مجھ پر اور میرے بچوں پر اپنی روشن و رنگین زندگی کی وہ تمام متاعِ شادِ کردی جس کی قیمت اس دنیا میں آج تک کوئی

تیں لگا سکا۔ آہ کیا نثار ہونا اور کس کس طرح نثار ہونا! جس نے تمام عمر یہ خیال دل میں نہ آنے دیا کہ اپنی استعداد سے اپنے آپ کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچنا چاہئے۔ بلکہ اسی کا قائل رہا اور اسی پر مرٹا کہ اس کی نیرت اور اس کی ہر متاع میسے اور میسے بیوی بچوں ہی کو راحت و فائدہ پہنچانے کے لئے تھی۔

بہادر اور بادشاہ فائق بھی مکان کا ارمان اپنے ساتھ ہی لے گئے میں اپنا مکان دیکھ کر مسرور و مطمئن ضرور ہوتا ہوں لیکن جب رفیق اور یوب یاد آتے ہیں تو دل بے اختیار ہو کر ناممکنات کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ یعنی کاش دونوں زندہ ہو جاتے اور میں انہیں اسی مکان میں لے آتا ہوں کہ گنگا ان کا خوش ہوا در دھوم مچانا دیکھتا اور مطمئن ہو جاتا کہ میں نے بھی کچھ کام کیا!

سردی کا زور اور دوستوں کا مجمع تھا۔ ہم سب ڈاکٹر عباد الرحمن جی کے ہاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے کہ یوب مرحوم نے کہا سردی لگے ہی ہے۔ اسی نے توجہ نہ کی تھوڑی ہی دیر کے بعد لیکن کسی قدر بتقیرا ہو کر کہا۔ بڑی سردی ہے۔ ”رشد صاحب میں چلا“ ڈاکٹر عباد نے کہا۔ نہ ٹھکانے سے رہتے ہو۔ سردی کیوں نہ لگے۔ یہ کہہ کر اندر سے اپنا وزنی گرم اور کوٹ لائے اور مرحوم کو بی طرح اڑھا دیا چلے منگائی اور پلائی۔ اس کے بعد ہی مرحوم نے کہا ”رشد صاحب میں چلا“ میں ان کے لہجہ سے اور ان کے چہرہ کی طرف دیکھ کر چونک کر کھیل

ختم کر دیا گیا اور ہم سب انہیں اڑھا ڈھکا کر ان کے مکان پہنچائے صبح سے  
 بخار نے زور پکڑا۔ لاکھ لاکھ جن کئے گئے۔ لیکن بخار اور کمزوری بڑھتی گئی۔ دوپہر  
 کی تشویش بڑھی۔ مایوسی بڑھی اور مرض الموت بڑھا۔ دو تین ہفتہ کے اندر سب  
 کچھ ہو گیا کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ مرض کیا تھا۔ سینے میں فیصلہ کیا کہ وقت آہنچا۔  
 شام کے قریب نزع کے عالم میں تھے۔ مکان کے باہر یونیورسٹی کے طلباء  
 عمائدین کا مجمع تھا لیکن ان سے قریب ورا نہیں میں ملا جلا ایک اور ہجوم تھا۔  
 بھنگی بہشتی۔ چیرا سی۔ نائی۔ دھوبی۔ بیرے۔ باورچی۔ خانسا۔ مانہ۔ خوانچہ  
 والے اور ان میں سے بہتوں کے بیوی بچے خاموش۔ مایوس سر جھکائے۔  
 اور یہ وہ ہجوم تھا جو کسی مرنیوالے کے دروازہ پر جبکہ وہ اس جہان سے گزرنے  
 والا ہو۔ میں نے گذشتہ پچیس سال میں نہیں دیکھا تھا۔  
 مرحوم کو سپرد خاک کیا گیا۔ مولنا ابوبکر صاحب نے قبر کے سربانے کھڑے ہو کر فرمایا۔  
 بھائیو! ”ایوب اپنے پیدا کر نیوالے کے ہاں پہنچ گئے اگر ان سے تم کو  
 کوئی تکلیف پہنچی ہو تو معاف کر دینا!“  
 گریہ سب کے گلو گیر ہوا۔ کسی نے روکا اور کسی سے نہ رکا!  
 ایک غم نصیب کے قلب کی گہرائیوں سے ایک دردور دناک صدالبندہ نے۔  
 ”کیا یہاں کوئی اب بھی موجود ہے جس پر ایوب کی خدمات کا صلہ واجب الافر  
 نہ ہو“ اس آواز کو سنا کسی نے نہیں محسوس سب نے کیا!

## سراقبال مرحوم

جس سے جگر لالہ میں ٹھٹھک ہو وہ شب بزم  
 دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!  
 بڑی گرمی پڑ رہی تھی۔ دور دراز کے سفر سے واپس آ رہا تھا۔  
 علی گڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اُترا ہی تھا کہ ایک عمریز نے  
 کہا، ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے بہت تھوڑی  
 دیر کے لئے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے پلیٹ فارم کی ہر چیز موجود تو ہے  
 لیکن اس کی نہ کوئی آواز ہے اور نہ اس میں کوئی حرکت۔ یہ بات  
 صرف ایک آن کے لئے تھی، کائنات کا پھیلانے، پسینے اور سیدھا  
 کرنے والا، پُر ہیبت و پُر اسرار گراں پیکر ہیتمہ جو آن کی آن رُک کر  
 اُلٹا چلنے والا معلوم ہوتا تھا اپنے مقررہ رخ و رفتار پر لوٹ گیا۔ زندگی  
 اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ پھر رواں دواں نظر آنے لگی مکان  
 واپس آیا۔ نہ نہانا اچھا معلوم ہوا نہ کھانے کا جی ہوا، جیسے نفس اپنے  
 مطالبات چھوڑ بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے کمرہ بند کر کے لیٹ رہا۔  
 ذہن نے ماضی کے ادراق ایک ایک کر کے پلٹنے شروع کر دیئے۔  
 طفولیت کا زمانہ یاد آیا، جب اقبال کے اشعار چھپنے کی دوستی

کی طرح مزیدار اور جاں نثار معلوم ہوتے تھے اور خود اقبال کا یہ تصور تھا کہ وہ جو اشعار کہتے ہیں اُنھیں میں رہتے بستے ہیں، اقبال کی صورت وہی ہوگی جو میرے اپنے تصورات کے عمل سے پیدا ہوئی تھی۔ بہت اچھی سی، بہت چاہی جانے والی جیسی، جادو گروں جیسی، کچھ عجیب سی!

یہ بات بھی کچھ کم عجیب نہیں ہے کہ اب بھی جبکہ ادراک و شعور ایک گونہ مکمل ہو چکا ہے۔ اچھے اشعار کا مجھ پر وہی اثر ہوتا ہے جو بچپن میں ہوتا تھا۔ معنی و مطلب کے متیقن ہونے کے بعد ہی تھوڑی دیر کے لئے معلوم نہیں کیا چیز، تصورات کو معلوم نہیں کہاں کہاں لئے پھرتی ہے۔ وہی افسانہ و افسوس، وہی روشنی و تاریکی، لذت و اذیت، خوف و اُمید جو بچپن میں پیدا ہوتے تھے اب بھی بیدار ہو جاتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں لئے پھرتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں۔

۱۹۲۵ء میں میں مرحوم سے ملنے لاہور گیا تھا۔ اقبال کے کلام میں جو باتیں بچپن کے تجسس میں دلچسپ معلوم ہوتی تھیں اب تجزیہ و تجربہ کی زد میں ناقابل فہم معلوم ہونے لگی تھیں میں صرف پڑھنے اور اپنے طور پر لطف لینے کی منزل سے گزر چکا تھا۔ اب پڑھانے کو

پُر فکر و پُر لطف بنانے کا فرض عائد ہوتا تھا۔ شعر میں شاعر غالباً نظر آتا تھا اور ہر دَلّا وینر سی تاثرات پر ہی نہیں بلکہ فکر و تجربہ کی صحت و صداقت پر منحصر معلوم ہوتی تھی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں میں نے محسوس کیا کہ خود شاعر کو دیکھا جائے۔ اس کے اشعار ہی سے نہیں بلکہ اس کی شخصیت سے بھی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاعر اپنی ترنگ میں جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے۔ یہ تو نسبتاً آسان ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کی ترنگ یا تذبذب سے کس طرح عمدہ برآ ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی جذبات کی ترجمانی کر سکتا ہے یا دوسروں کی تشفی بھی کر سکتا ہے۔ غالباً دن کے نو دس بجے ہوں گے، میں مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا، کپڑے پہن کر کسی مقدمہ کی پیر دی میں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ سیاہ عقدہ دبو، یا ندھتے کا لہر دست کرتے ہوئے برآمد ہوئے، گٹھا ہوا جسم، چوڑی چکی ہڈیاں مردانہ انداز، آنکھوں کی ساخت اور موچھوں کی وضع کسی قدر تو راینوں جیسی، سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا، مُسکرا نے میں آنکھوں کے گوشوں میں جھریاں پڑتی تھیں جن سے ذکارت و ملاحظت کا اظہار ہوتا تھا۔ بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر دیر تک ہاتھ میں ہاتھ لئے رہے بھاری بھر کم لہجے میں بولے، آپ ہیں جی، صدیقی صاحب! میں اقرار کرتا ہوں



کہ مرحوم کا ڈیل ڈول اور اُن کا حلیہ دیکھ کر متحیر اور مرحوم کے انداز  
تخاطب اور لہجہ سے کسی قدر دل گرفتہ ہوا۔ اتنے میں نوکر کو آواز دی  
اور پنجابی میں قلم لانے کو کہا۔ قلم کا تلفظ سنکر میں گھبرا اٹھا۔ علیگرٹھ  
میں پنجابی تلفظ سے آشنا ہو چکا تھا لیکن ذہن میں معلوم نہیں،  
کیوں یہ بات جم گئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال اس طرح کی معذوریوں سے  
مستثنیٰ ہوں گے۔

لیکن میں کیا بتاؤں کہ اپنی پہلے سے بنائی ہوئی بہشت کو یوں  
درہم برہم ہوتے دیکھ کر مجھ پر جو اثر جس درجہ ہونا چاہئے تھا وہ نہ ہوا۔  
مرحوم کچھ اس انداز سے ملے اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ خود ان کے  
تلفظ میں کچھ ایسا خلوص اور ان کے ہاتھ ملانے میں وہ شفقت اور  
ناقابل بیان مروت و مرحمت تھی کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ ایسا معلوم  
ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا۔ جیسے ایک نیا تجربہ بڑا اچھا  
تجربہ حاصل ہوا جس کا میں مستحق ضرور تھا گو اس کا منتظر نہ تھا۔  
جیسے مجھے ایک نئی جس توفیق ہوئی جس کو چھین لیا جاتا تو میں کوئی  
بڑی کمی محسوس کرنے لگتا۔

تھوڑی دیر کے لئے کمرہ میں آ بیٹھے۔ علی گرٹھ کا حال دریافت  
فرماتے رہے، آواز بھاری تھی لیکن بلند ہونے کے ساتھ ساتھ زور

اور صفائی بڑھتی جاتی۔ میں نے اس خود اعتمادی کے ساتھ جس میں عالمانہ اور اہل علمہ دونوں انداز متوازی و متوازن ہوں کم لوگوں کو گفتگو کرتے سنا ہے۔ یہی بات مجھے ڈاکٹر صاحب میں ملتی ہے، علامہ جوگ کی باتیں سنئے، بشرطیکہ وہ بات کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو فوراً محسوس ہوگا کہ ان کی باتیں صرف زبان سے نہیں ادا ہوتی تھیں اور وہ صرف اپنے الفاظ اور فقروں پر نہیں بھروسہ کرتے تھے بلکہ وہ باتیں کہیں دور سے اور بڑی گہرائی سے آتی تھیں۔ ان کی گفتگو حشو و زوائد سے قطعاً پاک ہوتی تھی۔ ان کی بحث اتنی واضح اور جامع ہوتی تھی کہ وضاحت و جامعیت بجائے خود صنائع و بدائع معلوم ہونے لگتی تھیں گفتگو کرنے میں ان کی آنکھیں نصف سے بھی کچھ کم کھلی رہتی تھیں البتہ جب گفتگو میں گرمی اور روانی پیدا ہو جاتی تھی تو آنکھیں پوری کھل جاتی تھیں اور چہرہ پر خون کی سُرخ جھلکنے لگتی تھی۔ اُسی دن شام کو دوسری ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے اس وقت ایک نوجوان شاعر آگئے جو کچھ دیر تک اپنا فارسی کلام سناتے رہے، اُن کی شاعری اور لہجہ دونوں پر جدید ایرانی رنگ غالب تھا۔ کچھ اور لوگ بھی آگئے۔ نوجوان کی گفتگو میں تغلی زیادہ

بڑا کٹر ڈاکٹر حسین خاں شیخ الجامعہ دہلی

تھی، ڈاکٹر صاحب کی مسلسل خاموشی کسی قدر بیزارمی میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ کچھ دیر تو بیٹھے رہے اس کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے، صحبت ختم ہو گئی۔ صرف دو چار اصحاب بیٹھے رہ گئے، اندر سے دیر میں برآمد ہوئے، چہرہ پر اب بھی انقباض طاری تھا۔ تھوڑی دیر تک حقہ کا ٹھٹھہ کرکٹ کرکٹ لیتے رہے، اس کے بعد فرمایا، نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ آگئے۔ اب طبیعت بحال ہو گئی تھی۔ ہر ایک سے پرسش حال کرتے وہ بھی اس طور پر نہیں کہ موسم اچھا ہے یا بُرا۔ رسمی باتیں تو وہ کرنا ہی نہیں جانتے تھے۔ ہر ملنے والے سے اس کے مشاغل اور اس کا مخصوص دکھ سُکھ سنتے۔ لوگ مرحوم کے حلقہ میں معتقدین کی حیثیت سے ڈرے سہے ہوئے نہیں بیٹھتے تھے بلکہ محبت اور بے تکلفی کی فضا ہوتی تھی۔ ہر شخص مرحوم کی باتیں بڑی گرمی توجہ سے سُنتا اور خود بھی بے تکلفی سے اپنی سُناتا۔

دوسرے دن پھر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آج کہیں جانا نہ تھا اس لئے بڑے اطمینان اور بے تکلفی سے باتیں شروع کیں۔ اس زمانہ میں اقبال کے نظریہ فوق البشر کا بڑا چرچا تھا بعض باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں اس لئے اس پر میں نے

خاص طور پر اپنے شہادت کا اظہار کیا۔ مرحوم نے بڑے ہی عالمانہ انداز سے اور انتہائی خوش دلی اور خود اعتمادی کے ساتھ جو ان کی سیرت کا بڑا ہی گرانقدر پہلو تھا، اظہار خیال کرنا شروع کیا مجھے اُس وقت جو چیز سب سے عجیب اور خوش آئند معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو مرحوم کس خوبی سے واضح کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا جیسے متنازعہ فیہ مسئلہ میں کوئی پیچیدگی تھی ہی نہیں۔ مخلصانہ نقطہ نظر کی یہ کرامت تھی کہ ناگہانی پیچیدگیوں اور نامعلوم مسائل کا حل بڑی آسانی سے سامنے آجاتا ہی۔ اسی صحبت میں عورتوں کا درجہ، فوق البشر، بعثت نبوی کا وقت اور مقام، فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسائل پر تقریباً تمام دن گفتگو فرماتے رہے میں نے اس بحث کا خلاصہ اپنے بعض گذشتہ مضامین میں جہاں تہاں کیا ہے لیکن ایک بات جس کا اعادہ میں بار بار کرتا رہا وہ یہ ہے کہ مرحوم کو صرف شاعر سمجھ لینا یا یہ کہ ان کے خیالات یا تصورات تمام کے تمام ان کے کلام میں مقید ہو چکے ہیں بڑی غلطی ہے۔ مرحوم کی فکر و نظر کا بہت کم حصہ ان کے کلام میں منتقل ہوا ہے۔ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور یہی نہیں بلکہ اکثر کچھ ایسا بھی محسوس ہوا جیسے بعض بالکل ہی نئی باتیں دورانِ گفتگو

میں ان پر کسی کوشش کے بغیر منکشف ہو گئیں !  
 فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسئلہ پر وہ انگریزی میں بہت کچھ  
 لکھ چکے تھے، مسودہ بھی ٹائپ ہو چکا تھا اور کافی ضخیم تھا۔ فرمایا ان  
 مسائل پر میں بعض مستند علما سے تبادلہ خیالات کرنا چاہتا ہوں،  
 تمہارے نزدیک کون لوگ ایسے ہیں جن سے رجوع کرنا سودمند  
 ہو گا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس کو چہ سے نابلد ہوں اس کے  
 علاوہ میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بیشتر علما علم دین  
 سے تو پورے طور پر واقف ہوتے ہیں لیکن موجودہ عہد کے اکثر  
 مسائل کچھ ایسے پیچ در پیچ ہوتے ہیں اور ماہرین فن ہی کے پیدا کئے  
 ہوئے ہوتے ہیں اس لئے ان پر ہمارے علمائے کرام مناسب  
 رائے قائم کرنے سے معذور رہتے ہیں۔ جب تک تنازعہ فیہ مسئلہ  
 کی ماہیت نہ معلوم ہو اس وقت تک ان پر صحیح حکم لگایا کیسے جاسکتا  
 ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے سامنے مسائل کی جو نوعیت ہے اس پر  
 اگر مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی  
 صاحب سے رجوع کیا جائے تو بہتر ہو گا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ  
 مرحوم نے یہ فرمایا کہ وہ ان دونوں بزرگوں سے تبادلہ خیالات  
 کر رہے ہیں یا کریں گے اتنا البتہ یاد ہے کہ دونوں کے بارہ میں

مرحوم نے اچھے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ خطوط کا جواب جلد سے جلد دیتے اور جب تک بینائی نے ساتھ دیا ہر خط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجتے۔ ان خطوط میں رسمی تکلفات کو بالکل دخل نہ ہوتا اور ہر بات کا جواب نہایت واضح اور جامع ہوتا۔ وہ مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک مسئلہ میں بھی بڑی صاف گوئی سے کام لیتے۔ بڑے آدمیوں کی طرح ان میں یہ کمزوری نہ تھی کہ جوابات ایسے ہوں کہ موقع بے موقع کترا کے نکل جانے کا امکان باقی رہے۔ ان کو اپنے جوابات پر بڑا اعتماد ہوتا اس کا سبب میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ وہ فلسفی، مفکر اور محقق ہونے کے علاوہ بڑے اچھے وکیل (بیرسٹر) بھی تھے۔ وہ جو کچھ کہتے یا لکھتے اس میں جذبات کو اتنا نہیں جتنا کہ فکر و تدبیر کو دخل ہوتا۔ چنانچہ ان کی تحریر و تقریر دونوں میں ایک اچھے قانون دان اور اچھی وکالت کرنے والے کا منطقی ربط ہوتا۔

ان کی شاعری کا امتیازی پہلو بھی یہی تھا جس طرح مسائل کی توضیح میں تدبیر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی تدبیر حکیم یا فلسفی کی بڑائی اور کامیابی کی دلیل ہے۔ ٹھیک اسی طور پر جذبات کا احتساب کرنا

اور اس کو مناسب و موزوں اسالیب میں ڈھالنا شاعر کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اقبال کی شاعری خود شاعری کی معراج ہے۔ انہوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دیدیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا۔ دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ اور ایقان و دوش بدوش کا فرما ملتا ہے۔ بحیثیت مجموعی اُن کا کلام پُرہہ کرہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اقبال کہاں اور کہاں تک حکیم اور کہاں اور کس حد تک شاعر ہیں۔ بلکہ حکیم اور شاعر (البتہ کہیں حکیم پہلے اور شاعر بعد میں اور کبھی اس کے خلاف۔ لیکن بالآخر دونوں) ایک دوسرے میں ممزوج یا ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ اور یہی اقبال کا آرٹ ہے۔ اس کا سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ اقبال نے فطری ملکات کو بشری ریاضتوں اور ماورائی بصیرتوں سے ایک نئی حسین اور لازوال صورت یا نوعیت بخشی۔ شاعر کا طبعاً شاعر یا مفکر کا طبعاً مفکر ہونا میرے نزدیک کوئی بہت بڑی نعمت نہیں ہے۔ نعمت تو وہ توفیق ہے جو فطری استعداد کو بشری نعمت بناتی ہے اور غالباً ہی توفیق وہ توفیق الہی ہے جو انسانیت کو نہ صرف انسانوں کے ہاتھ ہلاک ہونے سے بچاتی رہتی ہی بلکہ انسانوں ہی کے ہاتھ انسانیت کو فوضِ عظیم پر فنا نہ کرتی ہے۔

علی گڑھ میں ایک دن دوستوں کی ایک علمی صحبت میں حافظ کے مشہور شعر

صدیاد صبا اینجای سلسلہ می رقصد این است حرفی لئے تابادیہ پیمانی  
 پر گفتگو ہونے لگی۔ اپنے اپنے نقطہ نظر سے ہر ایک نے خوب خوب  
 موٹنگا قیاں کیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ ڈاکٹر اقبال سے رجوع کیا جائے  
 چنانچہ مرحوم سے استصواب رائے کیا گیا مرحوم نے فوراً ہی جواب لکھ بھیجا۔  
 ہر رائے پر محاکمہ کیا اور آخر میں لکھا کہ شاعر کے لئے یہ ضروری  
 نہیں ہے کہ وہ اپنے مطالب کو ریاضیات کے اصول مد نظر رکھ کر  
 پیش کرے اس لئے شعر کے مطالب جدا گانہ بھی ہو سکتے ہیں البتہ متضاد  
 نہ ہوں۔ آگے چل کر لکھا تھا کہ کبھی کبھی شاعر اپنی واردات کا پورے  
 طور پر خود استقصا نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں اس کے سوا چارہ  
 نہیں کہ وہ واقعہ بیان کرنے کے بجائے ایسی فضا کی طرف رہبری  
 کرے جس میں اس واقعہ کے پیش آنے کا قوی امکان ہو اور جہاں  
 ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق اپنے مطلب کی چیز ڈھونڈ لے۔  
 آخر میں لکھا تھا کہ شاعر کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مخاطب  
 کو منطق سے نہیں بلکہ ان رموز سے اپنا بے جو اس کے شعریں مہوپ  
 چھاؤں کی کیفیت پیدا کر رہے ہوں۔ شاعرانہ رموز نہ منطقیانہ رموز





ہوتے ہیں نہ فلسفیانہ، وہ شاعرانہ ہی رموز ہوتے ہیں۔

سلسلہ میں میں بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر صاحب انہیں دنوں یاد نہیں آتا کہ سلسلہ میں علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ ایک دن صبح مکان تشریف لائے۔ اُس روز مجھے خاص طور پر بڑی تکلیف تھی مشکل سے باہر آیا میں نے بڑی مایوسی کے ساتھ رُک رُک کر کہا ڈاکٹر صاحب کاش میں اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی مایوسی اور شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ ہائے اُن کا وہ چونکا لیکن فوراً ہی مسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمانا، نہیں جی صدیقی صاحب، کوئی بات نہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے گا، اچھے ہو جاؤ گے پھر لاہور آنا۔ مایوس کیوں ہوتے ہو مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے۔ اچھے مسلمانوں کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیے۔ اس کے بعد دیر تک اس انداز سے گفتگو کرتے رہے کہ میں ان کی موجودگی میں پھول گیا کہ بیمار بھی تھا۔ اُس وقت میرے ذہن میں یہ بات آنہیں سکتی تھی کہ میں تو اچھا ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر صاحب اس جہان سے اٹھ جائیں گے۔ اکثر یہ خیال آتا ہو کہ ڈاکٹر صاحب جس تکلیف میں مبتلا رہ کر عالم بقا کو سدھائے،

کاش کسی وقت میں حاضر خدمت ہو کر ان کے لئے وہ کر سکتا جو  
 انہوں نے میرے لئے کیا تھا۔ پھر سوچتا ہوں ڈاکٹر صاحب بہت  
 بڑے شخص تھے ان کو مجھ جیسا معمولی شخص کیا تسکین یا تشفی  
 دے سکتا تھا وہ خاصانِ بارگاہ سے تھے۔ اُن کا خدا سے خاص  
 تعلق تھا۔ لیکن اس بات سے طبیعتِ مطمئن نہیں ہوتی میں خوب  
 سمجھتا ہوں کہ گو معجزہ کا زمانہ نہیں رہا لیکن محبت و خلوص میں اب  
 بھی بڑی کرامتیں پوشیدہ ہیں۔ دوسروں کی وہ کونسی تکلیف ہے  
 جس کو میں یا آپ محبت سے کچھ اور نہیں تو تھوڑی دیر کے لئے زائل  
 نہیں کر سکتے۔

زندگی کے آخر عہد میں مرحوم کا تو سل دربار بھوپال سے ہو گیا  
 تھا۔ اس تعلق کے پیدا کرنے میں سرسید اس مسعود مرحوم کی  
 کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ اقبال کو جن مالی وقتوں کا سامنا تھا  
 اب اس سے نجات ہو گئی تھی، دورِ آخر کی بیشتر مشہور نظمیں مرحوم  
 نے بھوپال ہی میں لکھیں۔ بھوپال کا تنہا یہ کارنامہ میرے نزدیک  
 ان کارناموں میں سے ہے جن کو آئندہ آنے والی نسلیں کبھی  
 فراموش نہ کر سکیں گی۔ اگر افراد کی مانند اداروں کی بھی کوئی  
 معادہ ہے تو اسی ایک نیک کام کے صلہ میں بھوپال کی نخبات

آخری تیسقن ہے۔ اقبال کو غم روزگار سے نجات دلانا میر کزدیک  
 بہت بڑی سعادت ہے۔ چنانچہ اقبال کے بعض عقیدہ مند سراسر مسخ  
 مرحوم اور نواب محمد حمید اللہ خاں یا لقا بہ کی اس فرض شناسی اور  
 علم دوستی کو ان عزیز و گرامی ہستیوں کی اور بہت سی منزلتوں  
 پر فوق رکھتے ہیں۔ اگر انگریز قوم کے بارہ میں یہ بتایا جاتا ہے  
 کہ وہ برطانوی سلطنت سے محروم ہونا پسند کرے گی لیکن شکسپیر  
 کو چھوڑنا گوارا نہ کرے گی تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے  
 مسلمان بھی گراں سے گراں قیمت پر اقبال سے جدا ہونا پسند  
 نہیں کریں گے۔

مرحوم کو سید اس مسعود مرحوم سے بڑی شیفتگی تھی اسی طرح  
 سراسر کو بھی اقبال سے بڑا شغف تھا۔ لیڈی مسعود کو اقبال  
 مرحوم سے جو عقیدت تھی اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت و  
 آرام کا موصوفہ خیال رکھتی تھیں اس کا اندازہ اس سے  
 ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھوپال میں بڑے اصرار  
 کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کر دیا تھا جو ہر صبح آدھ  
 گھنٹہ تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سناتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب  
 لیڈی موصوف کی دوسری بچی نادارہ پیدا ہونے والی تھی۔ مرحوم

فرماتے تھے کہ ایامِ حل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلامِ پاک سُن لیا کرے تو بچے پر اس کا اثر بہت اچھا پڑے گا۔ ممکن ہے یہی خیال ہو جس کی بنا پر اقبال نے ارمغانِ حجاز میں دخترانِ ملت کو یوں مخاطب کیا ہے۔

ز شام ما بروں آدر سحر را      یہ قرآن باز خواں اہل نظر را  
تو میدانی کہ سوزِ قرار است تو      دگرگوں کرد تقدیرِ عمر را !  
مرحوم کا ملازم رحیم بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحبِ آئیں  
تو لیڈی مسعود کو کلامِ پاک سُننے کے لئے فوراً آمادہ کرے۔ مرحوم  
خود بھی دیکھتے رہتے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا رہتا ہے یا نہیں۔ ایک  
دن کا واقعہ ہے مرحوم نے رحیم بخش کو آواز دی کہ قاری صاحب  
آئے ہوئے ہیں، لیڈی مسعود کہاں ہیں۔ رحیم بخش نے کسی قدر  
آزردہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا، قرآن کیا سُنیں گی، وہ تو  
صبح ہی صبح باغ میں پھول کاٹنے چلی جاتی ہیں، وہاں سے فرصت  
ملے تو آئیں، میں کیا کروں، مرحوم خاموش ہو گئے پھر فرمایا بھر  
رحیم بخش صبر، یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے !

اہل نظر جانتے ہیں اقبال کی نظر کہاں تھی۔ میرے نزدیک  
تو اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا ہی ساجلہ اُن کی فکر و فرزانگی،

شاعری و شخصیت اور ان کا مجموعہ ان کی آفاقی بصیرت کا پورے طور پر ترجمان ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال ہم سے آپ سے اور بہت سے دوسرے لوگوں سے جو ہم سے آپ سے بڑے ہیں ملتے ہیں اور جدا ہو کر ان پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جنگی تشریح تو درکنار ان کا تصور بھی دشوار ہوتا ہے۔

بے موقع نہ ہو گا اگر یہاں ایک واقعہ مولانا محمد علی مرحوم کا بھی بیان کر دیا جائے۔ مولانا تحریک خلافت کے سلسلہ میں یورپ جا رہے تھے۔ ایک الوداعی صحبت میں کسی صاحب نے مولانا سے سوال کیا، اور کیوں جناب راستہ میں دل بہلانے کی خاطر کوئی کتاب بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کیوں نہیں، دوسرے صاحب نے پوچھا معاف فرمائے گا کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کس کس قسم کی اور کون سی کتابیں ہیں۔ مرحوم نے فرمایا دو کتابیں کافی ہیں اور وہی میں نے رکھ لی ہیں۔ حاضرین ان کتابوں کا نام سننے کے لئے سراپا اشتیاق بن گئے۔ مرحوم نے اپنے خاص انداز میں فرمایا ایک تو کلام پاک ہے اور دوسری دیوان داغ! اسے محض ایک لطیفہ ہی کیوں نہ سمجھا جائے لیکن یہ بیان واقعہ ہو تب بھی میرے نزدیک اس سے مولانا کی پُر تجل شخصیت کی

دلربائی کچھ بڑھ ہی جاتی ہے۔ یہاں میں کسی طویل نفسیاتی مذاکرہ کو راہ دینا نہیں چاہتا۔ اصل مقصد دو غزیم المرتبت شخصیتوں کی ذہنی پرواز و پرداخت کی طرف صرف اشارہ کرنا ہے۔  
ڈاکٹر صاحب نے لیڈی مسعود کی پہلی بچی کے شیرخوارگی میں وفات پا جانے پر رنج و رماں کو تسکین و تشفی کا بڑا اچھا خط لکھا تھا اور آخر میں یہ شعر لکھا تھا۔

درچمن بود و لیکن نتواں گفت کہ بود  
آہ! از اس غنچہ کہ باد سحر اور انکشود!

اس کے بعد نادرہ پیدا ہوئی تو ڈاکٹر اقبال بھوپال میں تھے اور لیڈی مسعود اندور میں۔ نادرہ کی ولادت سے اقبال بے انتہا مسرور تھے اور اس کو دیکھنے کے بے حد مشتاق تھوڑے ہی دنوں بعد لیڈی مسعود اطلاع دے بغیر بھوپال آ گئیں۔ اتفاق سے سر اس مسعود اور سر اقبال دونوں یکجا تھے۔ سر اس نے فطرتی اشتیاق سے آگے بڑھ کر بچی کو آغوش میں لینا چاہا، اقبال نے آواز دی، "نہیں پہلا حق شاعر کو پہنچتا ہے چنانچہ ماں نے نادرہ کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں دے دیا۔"

مجھے اکثر خیال آتا ہے کیا نادرہ بڑی ہو کر کبھی اس پر بھی غور کریگی

یا نہیں کہ وہ نہ صرف بڑے باپ کی بیٹی ہے بلکہ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھی اس کی نفسیاتی پرداخت کا اہتمام اپنے زمانہ میں اسلام کے سب سے بڑے اور برگزیدہ شاعر نے کیا تھا اور آغوشِ مادر سے سب سے پہلے براہِ راست وہ اسی شاعر کے آغوش میں آئی! ڈاکٹر صاحب نے جاوید اور بانو کی تربیت و نگہداشت کے لئے ایک شریف جرمین خاتون کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ یہ خاتون میرے ایک عزیز دوست کی رشتہ دار ہیں اور کچھ عرصہ تک میری بیوی بچوں کے ساتھ گھر کے ایک عزیز رکن کی حیثیت سے رہ سہ چکی تھیں۔ میں نے ہی ڈاکٹر صاحب سے تحریک کی تھی کہ یہ خاتون بچوں کی نگرانی و تربیت و تہذیب میں بہت مفید ثابت ہو گئی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب سے کچھ عرصہ تک خط کتابت ہوتی رہی میں نہیں بتا سکتا کہ مرحوم ان بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے کتنے فکر مند تھے۔ ان کو معاوضہ کی کمی بیشی پر مطلق اصرار نہ تھا لیکن وہ خاتون کی سیرت و عقائد کی چھان بین میں اس درجہ کاوش کرتے تھے کہ بالآخر میں نے کسی قدر تھک کر ڈاکٹر صاحب کو لکھ دیا کہ آپ کا نقطہ نظر میں پورے طور پر سمجھ چکا ہوں۔ مزید گفتگو سے کہیں بہتر یہ ہو گا کہ آپ امتحاناً انہیں دو ایک ہفتہ کے لئے اپنے

ہاں بلا لیں اور ان کے انداز و اطوار کو نظر میں رکھیں۔ اس کے بعد فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ اُن کا رکھا جانا مناسب ہی یا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب اس تجویز کو مان گئے اور جرمن خاتون جن کو ہمارے ہاں کے چھوٹے بڑے سب آپا جان کہا کرتے تھے لاہور پہنچ گئیں ان کے پہنچنے کے بعد مرحوم کے جو خطوط آتے ان میں ہر ایک میں ان خاتون کی شرافت و قابلیت و دیانت و امانت و محبت و مروت کا ذکر ہوتا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو ان پر اتنا اطمینان و بھروسہ ہوا کہ رحلت کے وقت مرحوم نے ان دونوں بچوں اور سارے گھر بار کو خاص طور پر ان کے سپرد کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات پر بہت سے لوگوں نے ان جرمن خاتون کا بڑے اچھے الفاظ میں اپنے مضامین اور بیانات میں تذکرہ کیا۔

مرحوم کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد میں لاہور گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے جاوید اور باتو کو دیکھا۔ جاوید کسی قدر سیانا تھا ایک حد تک خاموش اور کم آئینہ کھل کر ملتے یا بات کرنے میں بھی تکلف کرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مرحوم کو جاوید کس درجہ عزیز تھا اور وہ اس کو کیا دیکھنا چاہتے تھے اور جاوید ان کے کلام



میں کہاں کہاں اور کس کس طرح جاری و ساری تھا۔ لیکن میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ خود جاوید پر اس کا وہ اثر نہیں ہو جو ہونا چاہئے تھا۔ لیکن باتو! مشکل سے ۶-۷ سال کی عمر ہو گی کیسی تندرست، چنچل، ذہین، خوبصورت بھولی بھالی بچی! ایسی لڑکی جو صرف ڈاکٹر اقبال کی لڑکی ہو سکتی تھی!!

جرمن خاتون نے بتایا کہ ڈاکٹر اقبال کی وفات کے بعد ایک رات بانو حب معمول میری چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی، باتیں کرتی اور خاموش ہو جاتی، پھر باتیں کرنے لگتی لیکن رہ رہ کر کسی ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتی، میں نے پوچھا، بانو آج کیا بات ہو تم اچھی اچھی باتیں نہیں کرتیں، بانو نے کہا، آپا جان، آپا موجود تھے تو یہ چاند اور ستارے کتنے چمکدار اور اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اب یہ کیوں نہیں چمکتے!!

جرمن خاتون نے یہ بھی بتایا کہ خود مرحوم کو باتو سے عشق تھا، چنانچہ بالکل آخری زمانہ حیات میں ڈاکٹر اقبال کا جی صرف بانو سے بہلتا اور بانو بھی مرحوم سے اس طور پر وابستہ ہو گئی تھی جیسے مرحوم اس کی ماں، اس کی بھولی اور اس کا کھلونا سمجھی کچھ تھے اسی سلسلہ میں خاتون کا بیان ہے کہ جب مرض نے نازک صورت

اختیار کر لی اور مرحوم پر ضعف کی وجہ سے اکثر غفلت طاری ہو جاتی تو ڈاکٹروں نے مریض کے کمرہ میں بانو تک کا آنا بند کر دیا ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ بانو نہیں معلوم کیسے ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں آ گئی جہاں کوئی اور نہ تھا، میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ بانو ڈاکٹر اقبال کے سینہ پر بیٹھی ہوئی بے تکلف بات کئے جا رہی ہو میں گھبرا اٹھی، سر اقبال کی بینائی تقریباً زائل ہو چکی تھی میں نے دبے پاؤں قریب جا کر بانو کو بہلا کر جُدا کرنا چاہا۔ سر اقبال بول بھی نہیں سکتے تھے۔ بڑی ہی خیف آواز میں کچھ ایسا کہا اور ان کی تقریباً بند آنکھوں میں کچھ ایسی جنبش ہوئی جیسے وہ چاہتے تھے کہ بانو کو ذرا دیر کے لئے جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ بانو کے اس طرح موجود ہونے سے جیسے اُن پر ایک گونہ اطمینان سا طاری تھا اور زندگی کی ڈوبتی بجھتی ہوئی قندیل کو وہ اپنی جذبہ امتنان و مسرت سے ایک لمحہ کے لئے اور اُبھارے اور روشن کئے ہوئے رکھنا چاہتے تھے!

یہ خاتون اب بھی جب کبھی سر اقبال کا تذکرہ کرتی ہیں تو ان کے گریہ گلو گیر ہو جاتا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ میں نے ایسا مخلص اور شریف انسان نہ دیکھا۔ جب میں پہلے پہل پہنچی تو کھانے پر

ڈاکٹر صاحب پورے کپڑے پہن کر آئے اور اُنہوں نے دسترخوان کے وہ آداب ملحوظ رکھے جو یورپ میں اونچے سے اونچے گھرانوں میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کو تجھ پر کچھ ایسا اعتماد ہوا کہ اُنہوں نے بڑی صفائی اور بڑے ہی لطف سے یہ خواہش ظاہر کی ان کو اس تکلف سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ صرف بنائین اور تہہ پہنے کھانے پر چلے آئے۔ جب تکلیف اور ضعف زیادہ بڑھا تو کمرہ ہی میں کھانا کھا لیتے۔ ان میں بھروسہ کرنے کا عجیب مادہ تھا۔ میری کسی تجویز کو اُنہوں نے کبھی رد نہیں کیا اور گھر کے معاملات میں مطلق دخل نہیں دیا۔ وہ اپنے عزیزوں سے زیادہ کہیں زیادہ میرا اعتبار کرتے تھے۔ اور مجھے اس بات کا فخر ہو کہ ڈاکٹر صاحب نے اکثر فرمایا کہ تمہارے ہونے سے مجھے گھر اور بچوں کی طرف سے ایسا اطمینان و آرام ہے جس کا میں بڑا متنبی تھا اور جس کی مجھے بڑی ضرورت تھی۔

دوسرے دن ایک عزیز کے ساتھ مرحوم کے مزار پر حاضر ہوا شاہی مسجد کی پائیں بائیں سمت اس مردِ قلندر کو آسودہ خاک پایا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ یہ اُس اقبال کی آرامگاہ ہے

سکھائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ جس نے  
اور آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی۔

میں نے محسوس کیا کہ بادشاہی مسجد کی پراسرار و پُر وقار ضخامت و قدامت اور اس کی مخصوص فضا اور روایات ذہن و دماغ پر اس درجہ اور اتنا جلد مستولی ہو جاتی ہیں کہ ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہونے کے قابل ہی نہیں رہ جاتا چنانچہ میرے دل میں بے اختیار اور بار بار یہی آیا کہ اقبال کا مزار مستقل حیثیت سے کیسے اور ہونا چاہئے تھا۔ جہاں اقبال کے تصور میں مزاحم ہونے والی کوئی اور چیز نہ ہوتی۔

اقبال زندہ تھے تو اطمینان رہتا تھا کہ کوئی نہ کوئی موقع نکال کر اُن سے مل آؤں گا اور اس کا یقین تھا کہ اُن سے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور معلوم ہوگی جو میری ذہن کی استعداد کو شگفتہ کرے گی اور دل کے دلولوں کو بڑھائے گی۔ ذہن کی کچھ الجھنیں بھٹیں جن کے بارے میں یقین تھا کہ ڈاکٹر اقبال انہیں سلجھا دیں گے کبھی محنت و مطالعہ سے بچنے کے لئے دل کو بہلا لیا کرتا کہ دماغ پاشی کیوں کی جائے کسی دن ڈاکٹر اقبال سے جا کر اپنا اطمینان کر لوں گا۔ جس وقت وفات کی خبر ملی تو معلوم ہوا کہ وہ تمام ذہنی تصورات جن میں بعض دھندلے تھے اور بعض گریز یا او جن پر تعمیر کھڑی کر لینا میری زندگی کی کرامات میں سے ہوتا، اقبال کے اٹھ جانے سے

سب کے سب درہم برہم ہو گئے۔ اب تہ دل ولہ رہا کہ ان کا پھر سے تعین کیا جائے اور نہ یہ اُمید کہ اقبال جیسا رفیق و رہبر ملے گا جو انکی تشکیل و تزئین میں مدد دے گا۔

اقبال کا ایک خاص وصف یہ بھی تھا کہ وہ اکثر ایسی باتیں بتا دیتے تھے اور اس طرح سے بتا دیتے کہ اُس ایک بات سے بے شمار نئی نئی اور عجیب باتیں از خود برآمد ہونے لگتی تھیں اور کم سے کم مجھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اُن کی اس ایک بات سے بہت سی دوسری باتیں نکال سکتا تھا پھر لطف یہ کہ یہ دوسری باتیں اصل بات سے کوئی واسطہ براہ راست نہیں رکھتی تھیں اُن کی بتائی ہوئی باتیں نہ صرف نئے راستے کھول دیتی تھیں بلکہ اُن راستوں پر مجاہدانہ و مجتہدانہ انداز سے گرم رفتار ہونا بھی آسان اور دلچسپ ہو جاتا تھا۔

اقبال دوسروں کے نزدیک کیسے ہی کچھ نہ ہوں میرے لئے تو وہ بہت کچھ تھے۔ میں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ بہت سے مقامات پر وہ خود اپنے آپ کو بہت سچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اگر یہ شاعری ہے تو ہمیری کیسا ہے؟ اور یہ پیغمبری ہو تو شاعری کا کیا درجہ ہے؟

# احسن مارہروی (مرحوم)

عشق کوئی ہمدرد کہیں بدلت میں پیدا کرتا ہے

کہہ رہیں گونا گونا برسوں لیکن اب فریاد نہیں!

(میر)

مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی مرحوم کے ساتھ شعبہ اُردو میں سالہا سال کام کرنے کا اتفاق رہا۔ اس دوران میں مرحوم کی صد ہا خوبیاں ہم سب کے سامنے آئیں۔ شعبہ کو ان سے بڑی تقویت تھی اور مسلم یونیورسٹی کے اندر باہر ان کا نام بڑی عزت و محبت سے لیا جاتا تھا۔ ان کے خاندان کی بزرگی کا دور و نزدیک شہرہ تھا۔ اُردو وال طبقہ میں وہ بڑی توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ زبان کے مستند عالم تھے اور اس بارہ میں ان کے فیصلے اکثر و بیشتر بے چون و چرا تسلیم کئے جاتے تھے۔

مولانا قدیم مسلک شاعری کے پیرو تھے۔ زبان کی صحت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور شاعری کی ان لوازم کی پوری پابندی کرتے تھے جو ان کے پیش روؤں سے ان تک پہنچی تھی۔ بایں ہمہ وہ اُردو ادب

شاعری کے جدید اسالیب اور جدید تصورات سے نہ بیگانہ تھے نہ نیرا۔ اس نئے دبستان کے نقطہ نظر کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شاعرانہ کمال کی جی کھول کر داد دیتے تھے۔ خواہ شاعر کا مسلک اُن کے مسلک سے بالکل جداگانہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ اُردو میں مغربی انداز کی تنقید اُن کے سامنے مروج و مقبول ہوئی۔ وہ خود اس کے پیرو نہ ہوئے لیکن اس قسم کے مباحث بڑی توجہ اور شوق سے سنتے اور جہاں قائل ہو جاتے وہاں داد دینے میں زرا تاثر نہ کرتے۔ اُردو زبان یا شاعری پر خواہ کوئی بحث کرتا یا کسی قسم کی بحث کرتا مولانا اس بڑے شوق و انہماک سے شریک ہوتے۔ اپنے خیالات و تصورات کے اظہار میں بڑے مخلص و دلیر تھے۔ دوسرے کے نقطہ نظر کو توجہ اور صبر کے ساتھ سننے میں بے نظیر تھے۔ اس اعتبار سے ان کو ”ترقی پریر“ اور ترقی پسند قرار دینے میں تاثر نہ کرنا چاہئے۔ ترقی پریر یا ترقی پسند کا مفہوم آخر یہی تو ہے کہ جرأت کے ساتھ اپنی کہے اور صبر کے ساتھ دوسرے کی سننے۔

رحلت کے وقت مرحوم کا سن چھیاسٹھ<sup>۶۶</sup> کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ جسم کے بھاری بھر کم تھے۔ ہر طرح کی سوسائٹی میں اپنی خوش دلی اور تواضع منشی سے مقبول تھے۔ علمی باتوں یا مخصوص زبان بیان کے

مسائل کو منقح کرنے کے بڑے دل دادہ تھے۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کو دوسرے سے پوچھ لینے میں خواہ وہ اُن سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا۔ مطلق تامل نہ کرتے تھے۔ ہم سب نے اکثر دیکھا کہ شعبہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ باتوں باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آگیا جس کی صحت یا محل استعمال پر اختلاف آرا ہوا۔ فوراً اس کی ٹوہ میں لگ گئے۔ اکثر یہ محسوس ہوتا جیسے کھوئے کھوئے سے ہیں۔ بار بار حوالہ کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے۔ مطلب برابری نہ ہوئی تو بلا کسی لحاظ و تامل کے حاضرین کو چھوڑ کر لا بُریری چلے گئے۔ وہاں بھی کام نہ چلا تو کسی کی دُن اُسی ادھیڑ بن میں رہے۔ بالآخر بات واضح ہو گئی تو خوش خوش اس دن کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات کے نتائج بتاتے۔

اس بارہ خاص میں مولانا کی سرگرمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی علمی مسئلہ جو ان کو نہ معلوم ہوتا اس کے دریافت کرنے میں مولانا کی سی سی و جستجو آج کل کے لوگوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ میں نے یہ بات جرمن پروفیسر کرنکو میں بھی پائی جو کچھ دنوں کے لیے مسلم یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ہو کر آئے تھے۔ پروفیسر کرنکو کے عالم متبحر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن ان کا بھی یہی عالم تھا جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کا اقرار جلد سے جلد نہایت



واضح الفاظ میں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وعدہ کرتے کہ دریافت کر کے بتائیں گے۔ جب بات منہج ہو جاتی تو ہر ایک کو بڑے لطف و اہتمام سے بتاتے۔

پروفیسر کزنکو اکثر یونیورسٹی لائبریری کے دفاتر میں بیٹھتے تھے۔ بوڑھے بہنیں مکھ۔ بات کرنے کے شائق۔ متوسط جسم لمبا قد۔ عینک لگائے ہوئے۔ اجنبی سے بھی اس طرح ملتے جیسے اس سے کافی واقف ہیں۔ جماعت اساتذہ کے اکثر لوگ تھوڑی دیر کے لیے ضرور لائبریری پہنچتے ہیں۔ پروفیسر کزنکو کو کسی نہ کسی علمی بحث پر ضرور گفتگو کرتے اور ہر شخص کو فرداً فرداً مخاطب رکھتے ہوئے پاتا گفتگو کے دوران میں کوئی آجاتا تو اسے مخاطب کر کے جس حد تک بحث ہو چکی ہوتی اس کا خلاصہ سنا کر آگے بڑھتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار (Model de Suisse) کے تلفظ پر بحث چھڑ گئی۔ پروفیسر کزنکو نے فرمایا کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ پھر اس کا صحیح تلفظ اپنے ہونٹوں کو ایک خاص شکل دے کر بتایا اور اسی پر گفتگو کی بلکہ فرداً فرداً ہر شخص سے صحیح تلفظ کرایا۔ اس وقت حاضرین کی تعداد سات آٹھ آدمیوں سے کم نہ تھی !!

یاد رہے اکثر استفسارات آتے رہتے اور یہ تمام تر احسن مرحوم

ہی کے سپرد کئے جاتے۔ ان پر وہ بڑی محنت کرتے اور بڑی جستجو و تحقیق کے بعد جواب مرتب فرماتے۔ سند میں اساتذہ کے شعر فی النور پڑھتے۔ کہتے تھے اُستاد داغ مرحوم کے آخری دور میں ان کے حلقہ میں بیٹھنے والوں کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ الفاظ کی تذکیر تانیث یا محل استعمال کے بارہ میں استاد سے فرمائش کرتے رہتے کہ وہ اُن الفاظ کو اشعار میں استعمال کر دیں۔ استاد اس فرمائش کو بڑی خوشی سے پوری کرتے۔ اس سے داغ مرحوم کے شاگردوں میں تحقیق الفاظ اور محل استعمال سے بڑی دل چسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جو استفسارات باہر سے شعبہ اُردو میں آتے اُن پر مرحوم کا محاکمہ بڑے معرکہ کا ہوتا۔ وہ اس قسم کی بحث میں لفاظی کو دخل نہ دیتے بلکہ بڑے مستند دلائل اور حوالے پیش کرتے۔ اکثر استفسار کرنے والے بعد میں لکھتے کہ مولانا مرحوم ہی کا فیصلہ قول فیصل قرار دیا گیا۔

مرحوم کے پاس اُردو کتابوں کا بہت اچھا اور بیش قیمت ذخیرہ تھا۔ کتابیں بڑے شوق و محنت سے جمع کرتے۔ کہتے تھے دو چور یا جانچ کر ہیں۔ ایک دل کی اور دوسری کتاب کی۔ مولانا کی خدمت میں ہم سب بہت بے تکلف اور شوخ تھے۔ مرحوم بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے میں تامل نہ کرتے۔ مولانا کی صحبت میں ہر مذاق اور ہر شعر کے لوگ

موجود ہوتے۔ اُن کے خلوص اور شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بوڑھوں میں وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے بوڑھے خود ان کو بزرگ سمجھتے ہیں۔ نوجوان اور بچوں میں ایسے معلوم ہوتے جیسے اُن میں ان سے زیادہ دل چسپ کوئی اور نہیں۔ لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کی ان کو تاب نہ تھی یعنی زبان کی غلطی یا شاعری کے اسقام۔ کہتے تھے زبان کی غلطی کیسے سُن لوں۔ ساری عمر اسی میں گزاری۔ زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھ یا سُن پاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔ مولانا کی اس بات پر ہم سب خوب ہنستے لیکن وہ اس بارہ میں کہیں تکلف یا تامل سے کام نہ لیتے۔ ایک دن شعبہ اُردو میں ایک صاحب تشریف لائے۔ یہ گورداسپور میں رہیلوے میں ملازم تھے۔ مسودات کا بستہ ساتھ تھا۔ اردو شعر کا ایک مبسوط تذکرہ مرتب فرما رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ غیب نے ملازم کس حکمہ میں کی اور کام کیا شروع کر رکھا ہے۔ ہم سب نے ان کے کاموں سے بڑی دل چسپی کا اظہار کیا اور ان کی محنت کی داد دی۔ اسی اثناء میں مرحوم تشریف لائے۔ نو دوا رو سے نہ کسی قسم کی ہمدردی کی نہ تعرض۔ کچھ دیر بعد مہمان عزیز نے مولانا کی قصیدہ خوانی شروع کی۔ ہم سب نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور مولانا پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ مسودہ

کی طرف مائل ہوں۔

مولانا نے مطلقاً التفات نہ کیا اس سے نہ تو نووارد کی دل جمعی ہوئی اور نہ حاضرین کو تفریح۔ همان کو اصرار تھا کہ مولانا بھی کوئی مشورہ دیں۔ حاضرین نے بھی شہ دی۔ مولانا نے کسی قدر اکتا کر مسودہ کو بالکل یونہی ایک جگہ سے کھولا اور دو چار سطریں پڑھ کر فرمایا۔ یہ کہاں کی اُردو ہے اور یہ کیا خرافات لکھ مارا ہے۔ جاؤ اسے ٹھیک کرو۔ یہ لکھ مسودہ واپس کر دیا اور دوسری طرف مخاطب ہو گئے۔ اجنبی نے دبی زبان سے عرض کیا حضور اسے ٹھیک کر کے کب حاضر ہوں۔ مولانا نے بغیر ان کی طرف رخ کئے ہوئے جواب دیا۔ دس برس بعد! اجنبی کو بڑی مایوسی ہوئی، تھوڑی دیر بعد بڑے مایوس لہجہ میں عرض کیا دس برس بعد تو بڑی مدت ہوئی۔ مولانا نے فرمایا تو میں کیا کروں۔ مجھے تو اس کام میں چالیس سال لگ گئے پھر بھی پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ آپ کا کیا۔ کاتا اور لے دوڑے۔

مولانا کی اس بے رخی سے ہم سب بھی خفیف ہوئے۔ میں نے عرض کیا مولانا یہ بھی معلوم ہے یہ آپ کن صاحب کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ فرمایا کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا آپ ریلوے میں ملازم ہیں۔ فرمایا وہ تو ہیں پھر؟ میں نے کہا چاہیں تو بے ٹکٹ سفر

کرتے والوں کو نہ پکڑیں اور چاہیں تو چائے مفت میں پلوادیں !  
 مولانا بے ساختہ ہنس پڑے اور نووارد سے بہت کچھ التفات  
 فرمایا اور بات بڑی خیر و خوبی سے ختم ہو گئی۔

مولانا کے دل میں نہ کینہ رہ سکتا تھا نہ راز۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ  
 میرے دل میں ان کی سمائی نہیں۔ اس سے میں نے بہت نقصان  
 اٹھائے۔ لیکن کیا کروں۔ شاید یہ شاعری کی مار ہے کہ دل میں بات  
 نہیں رکھ پاتا۔

ایک بار ایک دوست نے مولانا کو اپنا انتہائی راز داں سمجھ کر ایک  
 معاملہ میں شریک کار بنایا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا میرے پاس آئے  
 عجیب حیرت میں مبتلا تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی راز ہے جو اپنی برہنہ  
 مولانا کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے اور بقول غالب ”سینہ بسمل سے  
 پر افشاں“ نکلتا چاہتا ہے۔ میں نے عمدہ دوسری باتیں شروع کر دیں۔  
 مولانا سنی آن سنی کرتے جاتے تھے اور جب انھیں یقین آنے لگا کہ کسی  
 طرح ان کی ہمت افزائی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں تو انھوں نے بے اختیار  
 ہو کر اپنے بھاری بھرکم جسم کو اس طرح تولا یا اس سے اپنے آپ کو ہلکا  
 کرنے کی کوشش کی جیسے گرمی میں کوئی شخص اپنے لباس کو جسم سے  
 علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور تکان میں آ کر ہچکچکیں مارتا ہے۔

ایک دفعہ ادھر ادھر دیکھ کر کہ کوئی غیر تو موجود نہیں ہے اپنی کرسی میری کرسی سے قریب کر لی اور کچھ کہنا چاہا۔

میں اُن کے ارادہ سے واقف ہو گیا۔ میں نے بھی ایک لمبا سانس لے کر اپنی کرسی اُن سے اتنی ہی دُور کر لی جتنی انھوں نے قریب کی تھی۔ مولانا کچھ ایسے ذہنی خلغشار میں مبتلا تھے کہ انھوں نے میری بے تیزی کا مطلق خیال نہ کیا اور نفس مضمون پر آنے کی جبر و جہد شروع کر دی۔ میں سمجھ گیا کہ مولانا اس دفعہ پس پا نہ ہوں گے۔ چنانچہ میں نے روک تھام کی بجائے راہ فرار اختیار کی اور اُٹھ کر بھاگا۔ مولانا باں جبہ غصری میرا تعاقب بھی نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے بیٹھے ہی بیٹھے فرمایا۔ رشید صاحب ارے وہ بھی سنا۔ میں بھاگنے کی سائنس و آرٹ یعنی (Rear Guard Action) ریر گارڈ اکشن درجنگ (پسپائی) سے پوری طور پر واقف تھا۔ میں نے بھاگتے ہوئے جواب دیا جی ہاں مولانا میں ابھی آتا ہوں۔ مولانا نے دیکھا کہ شکار نکلا جاتا ہے میں دروازہ سے نکل جانے والا ہی تھا کہ مولانا نے جان پر کھیل کر آخری گولی چلا ہی دی۔ میں گر گیا۔ مولانا نے رازہ فاش کر دیا تھا !۔

لے اس سلسلہ میں غالب مرحوم کا ایک شعر آپ کو یاد ہو گا۔

اہل ہوس کی فتح ہے ترکِ بندِ عشق جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے !

مولانا کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا۔ سید شاہ برکت اللہ علیہ الرحمۃ سترہویں صدی کے آخر یا اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں بلگرام سے مارہرہ تشریف لائے اور اس خاندان کے بانی ہوئے۔ چنانچہ مرحوم کی خاندانی عظمت و وقار کا ہر چھوٹا بڑا معترف ہے علم و فضل اس گھرانے سے بڑا دیرینہ اور گہرا تعلق رہا ہے اور خاندان خاناہہ برکاتیہ کا نام دور دور تک مشہور ہے۔ مرحوم کو اپنے خاندانی وقار و روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے تحفظ اور رکھ رکھاؤ میں حتیٰ الوسع کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ہر ملنے والے سے بڑی تواضع اور محبت سے ملتے تھے۔ وہ بہت جلد بے تکلف بھی ہو جاتے تھے لیکن سفلی اور بے تمیزی کے کبھی روادار نہ ہوئے۔

اس کی سب نمایاں مثال اس وقت نظر آتی جب مولانا کے گھر پر چھوٹے چھوٹے بچوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ مولانا کو بچوں سے بڑی الفت تھی اور بچے بھی ان سے اس طور پر وابستہ رہتے جیسے مولانا ان کا کھلونا تھے۔ جب کوئی بچہ آتا اور مرحوم کے پاس کوئی ملاقاتی بیٹھا ہوتا تو بچے نہایت احترام سے جھک کر آداب بجالا دیتے اور جب کچھ کہنا ہوتا مولانا کے قریب جا کر آہستہ سے کہتے۔ ایسے وقت مولانا بھی ان بچوں کا بڑا احترام کرتے اور جلد سے جلد نہایت لطف

شفقت سے ان کی طرف مخاطب ہو جاتے اور ایسا ظاہر کرتے گویا بچے کی آمد کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے ہر بچہ کا یہی طریقہ تھا۔ بچوں کا لباس اور وضع قطع بالکل قدیم زمانہ کی ہوتی۔ سفید ستھرے کرتے پہنا جاتے، سر پر بال باریک ترشے ہوئے۔ پاؤں میں جوتا۔ سر پر ٹوپی۔ چلنے پھرنے پہننے بولنے میں ایک طرح کی شائستگی و شائستگی پائی جاتی تھی۔

آج کل کے نوجوانوں اور بچوں میں سر پر طرح طرح کے بال رکھنے اور سنوارنے، ننگے سر پھرنے یا انواع اقسام کے نکر اور قمیص پہننے کا جو عام رواج ہے اور جسے آزادی کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ مولانا کے ہاں کے بچے ان سے بہت دور تھے۔ بعض لوگ اس پر کہ اٹھیں گے کہ یہ قل اعوذیت تھی۔ قل اعوذیت کا میں بھی قائل نہیں ہوں لیکن نسوانیت یا شہدین کے مقابلہ میں قل اعوذیت کو گردن زدنی بھی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ لباس وحیم کی ترئیں میرے نزدیک صرف عورتوں کے لیے مباح ہے۔

اس مسئلہ پر یہاں میں نہ مردوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور نہ عورتوں سے بگاڑ کر ناپسند کروں گا۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر زندگی کا اپنے اور دوسروں کے لیے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رسا ہونا ہی



زندگی کا اصلی مقصد ہے تو میرا خیال ہے کہ جہاں تک وضع قطع، سہن سہن، مرنے جینے، نفع یا بی و نفع رسائی کا تعلق ہے پُرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارہ میں نہیں ہیں۔ نہ ان کو ملزم قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ان پر ترس کھانے کی ضرورت ہے۔ نئی زندگی و نیا زمانہ مجموعہ صد کرامات سی لیکن میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الایام کے جبر و ترک کا حاقصل اور جو کرامت نہیں ریاضت کا ثمرہ تھی انسانوں اور انسانیت کے لیے زیادہ یا معنی اور زیادہ یا عیش خیر و برکت ہے۔

مرحوم پُرانی دنیا کے آوردہ تھے اور ان کی زندگی کی کشتی کے بندھن اور چولیس سب پُرانی ہی تھیں لیکن وہ نئے دور کے طوفان میں ان لوگوں سے زیادہ کامیاب اور زیادہ نفع رساں تھے جن کے پاس جدید ترین کشتیاں اور جدید ترین آلات و علوم تھے، مرحوم سے جن لوگوں نے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ کسی محفل اور کسی موقع پر بند نہ تھے۔ ہر جگہ ان کی پُریرائی خوش دلی سے کی جاتی تھی اس کے علاوہ وہ بڑے دوست پرست اور کنبہ پرور تھے ہر طرح کے لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔

اس سلسلہ میں وہ نہیر یا بھی بہت ہو گئے تھے اور تقریباً ساری

آبائی ملکیت ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ تنگ حالی سے اکثر پریشان رہتے تھے اور دوستوں، عزیزوں اور حاجت مندوں کی جیسی مدد کرنا چاہتے تھے نہیں کر سکتے تھے اس کا ان کو دلی رنج تھا لیکن وہ اپنی جیسی کر گزرنے میں کبھی تامل بھی نہ کرتے تھے۔ وہ جس طرح دوستوں کی مدد کر چکے تھے اسی طرح لیکن اس سے کہیں کم وہ دوستوں سے مدد متوقع رہتے تھے اور حاصل بھی کر لیتے تھے۔ اس پر ہم سب کبھی اُن پر فقرے بھی چیت کرتے تھے۔ ایسے ہی موقع پر ایک بار فرمایا۔  
 بھائی دیکھو تو جب میرے پاس کچھ تھا تو میں نے دوستوں اور حاجت مندوں کو بہت کچھ دیا اب جب کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے تو اپنے جسم و جان کو اکھٹا رکھنے میں تماشا ئے اہل کرم دیکھنا چاہو تو معرض کیوں ہوتے ہو!

مرحوم شاعری کے قدیم دبستان کے پیرو تھے۔ ساری عمر شعرو شاعری، تصنیف و تالیف، تحقیق و تدقیق میں گزاری۔ اپنے اُستاد کے مسلم البشیرت پیرو تھے۔ لیکن کلام میں اُستاد جیسی اچھوتی جیتی جاگتی شوخی رنگینی و جدت آفرینی نہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے شاعر کی طرح داغ نے بھی اپنا ثانی پیدا ہونے نہ دیا۔ لیکن فن شاعری میں مرحوم کا پایہ نہایت اونچا تھا۔ زبان محاورہ و مصطلحات متعلقہ

شاعری کے سمجھنے پر کھینے اور برتنے میں مرحوم بے مثل تھے۔ ایسے لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں اور جلد جلد اٹھتے جا رہے ہیں۔ صحت زبان و مصطلحات شاعری کی پیروی اب کون کرتا ہے کس کو فکر و فرصت ہے اور کوئی کرے بھی تو کس برتنے پر کرے۔ شاعر ہم میں اب بھی اچھے سے اچھے موجود ہیں اور پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن فن کے واقف کار کہاں۔ فنی تبحر بڑی اہم چیز ہے۔ شاعری زبان و بیان ہی کے منتروں میں جادو جگاتی ہے۔ اس لیے زبان بیان کے مبصر و معیار کو ہم کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مولانا جیسا قادر الکلام اور زود گوشت شاعر میری نظر سے کم گزرا ہے۔ شعر کہنا ان کے نزدیک اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ نثر لکھنا۔ کئی سال ہوئے دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے تھے جو اعلیٰ حضرت خسر و دکن کے خرد سال جگر گوشہ کی غیر متوقع سانحہ وفات پر ہوش بکرا می نے لکھے تھے اور جن میں بعض فرمودات خسرو دی بھی شامل تھے۔ مولانا احسن مرحوم نے ان مضامین کو مشنوی کے پیرایہ میں قلمبند کرنا شروع کیا۔ عالم یہ تھا کہ شیعہ اُردو میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہر طرح کے طلباء اور رفقاءے کار سے گفتگو بھی جاری ہے، علمی بحثوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔ ہنسی مذاق میں

بھی شریک ہیں اور مثنوی بھی لکھی جا رہی ہے۔ مشکل سے تین چار دن گزرے ہوں گے کہ مثنوی مکمل ہو گئی۔ مولانا کی مشکلات اور ان کے مشاعرہ کمال کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب اصل مصائب جن سے یہ مثنوی (موسوم بہ شاہکار عثمانی) لفظاً و معناً ماخوذ ہے پیش نظر ہوں۔ ایک دن شعر و شاعری پر بحث ہو رہی تھی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے بسبیل تذکرہ فرمایا کہ اصغر گوندوی مرحوم (جو اس وقت زندہ تھے) کی شاعری کا میں اس وقت قائل ہوں گا جب مصرعہ طرح دے دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ سامنے بیٹھ کر غزل مکمل کر دیں۔ مولانا مرحوم یہ سن کر آپسے سے باہر ہو گئے۔ آوازیں لگتی تھیں اس لیے جب کبھی جوش میں آ جاتے تھے تو ان کا لب لہجہ نہایت درجہ دل چسپ ہو جاتا تھا۔ ٹمل کا ڈھیلے آستین کا کمر تا پہنے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔ فوراً اٹھ بیٹھے۔ آستین چڑھالی اور برٹے ہی کرے تیور سے بولے۔ میاں ہوش میں آؤ۔ یہ کیا بک گئے۔ شاعر کو یوں پہچانتے ہیں؟ اصغر کو تمہارے فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے۔ جس کو تم شاعر سمجھتے ہو اس مسخرے کو میرے پاس لاؤ اور اس کی ٹانگ میری ٹانگ سے بانڈ دو اور ہم دونوں کے سر پر پیٹیں تباہ توڑ جوتے اس وقت مصرعہ طرح دو۔ پھر دیکھیں

کون کتنے پانی میں ہے۔  
 مولانا کی برہمی کا یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا۔ جب کسی قدر  
 دھیمے پڑے تو میں نے عرض کیا۔ مولانا آپ مسلم یونیورسٹی کی انجمن  
 حدیقۃ الشعر کے صدر ہیں۔ اگر مجوزہ آداب آئینہ سے نافذ کر دیے  
 جائیں تو کیا ہو۔ مرحوم مفتی مارکر کرسی پر لیٹ گئے۔ کہنے لگے بڑا  
 اچھا ہو، کم بخت گوئیوں سے نجات ہو جائے!

مسوری جانے والوں کو معلوم ہے کہ وہاں ”فصل“ میں کس  
 کس قسم کے وحوش و طیور کہاں کہاں سے کھینچ کر آتے ہیں اور صید  
 صیاد، دانہ و دام۔ تمنا و تماشا کی کیسی کیسی تیرنگیوں سے سابقہ  
 ہوتا ہے۔ یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مشاعرہ میں  
 مولانا بھی شریک تھے۔ سامنے کی صف اول میں وہ سب کچھ تھا  
 جس کی ترجمانی ایک شعر میں ہوتی ہے جو میرے بچپن میں یکہ بانوں  
 میں بہت مقبول تھا اس کا ایک مصرعہ مجھے اب تنگ یاد ہے  
 کہاں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے  
 مولانا کی باری آئی۔ بھلے مانسوں کے سیدھے سادے  
 لب و لہجہ میں یہ رباعی پڑھی۔

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں      بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں  
 فرمائیں معاف نوجوانانِ سخن      بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں  
 سننے والے اچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہمہ سا پیدا ہو گیا۔  
 اس کے بعد طرح میں غزل پڑھنی شروع کی جس کے اس شعر پر جو  
 صنفِ اولیٰ کو مدِ نظر رکھ کر پڑھا گیا مجمع سے وہ نعرہ تحسین و شہنیت  
 بلند ہوا کہ دیر تک کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی سے  
 بٹی ہوا میروں میں تھے حسن کی لبت      یہ مصرفِ خیرات سمجھ میں نہیں آتا  
 مرحوم کو مشاعرہ منعقد کرنے کا بڑا شوق تھا۔ بڑے لطفِ انہماک  
 سے اس کا اہتمام کرتے تھے اور شعراء و مہمانوں کی پزیرائی اس طور پر  
 کرتے جیسے خود مولانا ہی کے ہاں کوئی تہریب منعقد ہے۔ مولانا کے  
 دم سے دو ایک دن بڑی چل چل پہل کے گزرتے ہر شاعر کا پورا پورا  
 حفظِ مراتب ملحوظ رکھتے جس سے ہر شخص بہت مسرور و مطمئن رہتا۔  
 اسی سلسلہ میں ایک بار مولانا کے پاس ممبئی سے مشاعرہ میں شرکت  
 کا ایک دعوت نامہ آیا۔ چنانچہ رخصت لے کر ممبئی گئے۔ وہاں اجابہ پر  
 قدردانوں کا اصرار اتنا بڑھا کہ رخصت سے زائد ایک دن وہاں  
 ٹھہرنا پڑا۔ توسیعِ رخصت کی درخواست کی۔ اُس زمانہ میں یہاں  
 پرووائس چانسلر ایک انگریز تھے جن کی سیرت کا عجیب پہلو یہ تھا کہ

وہ بغیر کسی طرح کا نوٹس دیے ہر بات پر یا تو نہایت درجہ مسرور و متواضع  
ہو جاتے یا نہایت درجہ ہزار و ہریم۔ ان کے ہاں بچے کا کوئی راستہ  
تکھا ہی نہیں۔ مولانا کی ہر دم حاضری پر سخت برہم ہوئے اور ایسا معلوم  
ہوا جیسے مولانا کے ساتھ ساتھ شعبہ آزدگی بھی خیر نہیں۔ میری طلبی  
ہوئی۔ مکالمہ سنیں۔

صاحب (لال بھٹیو کا ہو کر اور مع کرسی میری طرف رخ کر کے)  
یہ کیا لغویت ہے؟

میں (متعجب و سرسیم ہو کر) غالباً آپ کا مطلب میرے علاوہ کسی اور  
سے ہے، جناب؟

صاحب (تقریباً دانت پیس کر) بے شک۔ مولانا صاحب نے  
کیوں درخواست دی، ان کو کیا حق تھا۔ اپنے فرائض  
انھوں نے غفلت برتی!!

میں - جناب والا مجھے بالکل نہیں معلوم کہ انھوں نے ایسا  
کیوں کیا۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہوگی  
ورنہ بظاہر مولانا صاحب اس قسم کے آدمی نہیں معلوم ہوتے  
جو اپنے حقوق یا فرائض کو ویسا ہی نہ سمجھتے ہوں جیسا کہ  
سمجھنا چاہیے۔

صاحب (نہایت غصہ ناک لہجہ میں) میں کہتا ہوں وہ آخر کئے کیوں؟

میں - شعر پڑھتے !

صاحب - شعر !

میں - شعر، جناب والا !

صاحب - اپنے شعر؟

میں - مولانا سے توقع تو یہی کی جاتی ہے۔

صاحب - لیکن یہ ہوا کیا ؟

میں - ہوتا ہوا تاکچہ نہیں عالی جاہ، لیکن ماننا کوئی نہیں۔

صاحب - تم شبہ کے انچارج ہو اس کا انسداد کیوں نہیں کرتے؟

میں - جناب والا میں نالائق تسلیم کرتا ہوں لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ

مولانا تشریف لائیں تو جناب اُن سے بھی گفتگو فرمائیں۔

بہت سی باتیں واضح ہو جائیں گی۔

صاحب - بہت خوب، مولانا صاحب کو میرے ہاں لانا (کسی قدر)

زہر خند فرما کر) مجھے اب تک اُن سے ملنے کی مسرت بھی

قصیب نہیں ہوئی ہے۔

پرووائس چانسلر صاحب کو اطلاع کی گئی۔ فوراً طلبی ہوئی



میں اور مولانا حاضر ہوئے۔ مولانا کو دیکھ کر صاحب کلیخت جھجکے اور فوہا اہی سرود ہو کر مولانا کو تعظیم دی۔ انتہائی گرم جوشی کا اظہار کیا۔ مزاج پرسی فرمائی۔ پزیرائی میں کچھ بچھے گئے۔ گفتگو بالکل نہ ہوئی۔ میرا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ البتہ یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کورنش بجالانے میں زیادہ اہتمام مولانا کی طرف سے ہے یا صاحب کی طرف سے، یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ وولٹن سرود قد کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھا کہ اب وداعی معانقہ ہوگا لیکن مصافحہ پر یہ صحبت ختم ہو گئی۔

مرحوم سے کلاس میں اکثر طلبا شوخیاں بھی کرتے تھے۔ مولانا کے پڑھانے کا انداز قدیم طرز کا تھا۔ وہ ہمہ تن معلم بن کر پڑھاتے تھے۔ اور طالب علموں سے اُن آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم نے اپنے استادوں کے ساتھ مکتب میں ملحوظ رکھے تھے۔ وہ بات اس زمانہ میں کہاں۔ ایک دن دیکھا کہ مولانا کلاس سے سخت آزرده و برہم چلے آ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں طلبا بھی آ گئے۔ معلوم ہوا کہ بعض طلبا کلاس میں سکوت و سکون قائم نہیں رہنے دیتے تھے۔ مولانا کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور کلاس سے چلے آئے۔ معاملہ رفت گزشت ہوا۔ کچھ دیر بعد اس مسئلہ پر مولانا سے گفتگو ہوئی۔ فرمایا۔ رشید صاحب!

طلبا پڑھتے نہیں آتے۔ وقت گزاری اور تفریح و تفریح کے لیے آتے ہیں۔ یہ دنیا میں جو چاہے کر لیں علم تو ان کو آنے کا نہیں! میں نے عرض کیا۔ مولانا! آپ کا فرمانا بالکل صحیح ہے۔ لیکن کہا کیجئے گا۔ یہ طلباء کا قصور نہیں ہے۔ دنیا کا یہی رنگ ہے جو باتیں ہمارے آپ کے زمانہ میں قدر و قیمت رکھتی تھیں وہ اب مردود ہو چکی ہیں حفظ مراتب اٹھ چکا ہے۔ یہ زمانہ احتساب نفس کا نہیں ہے مطالبات نفس کا ہے۔ گڑھے نہیں۔ لڑکوں کو معاف کر دیجئے۔ ان کو نہیں معلوم وہ کیا کر رہے ہیں اور کن اثرات کے شکار ہیں۔ مرحوم کو اطمینان نہیں ہوا، بولے جی نہیں۔ میں نالائقوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔ مجھے کوئی دوسرا کلاس دیجئے۔ مولانا کی اس برہمی سے میں لطف اندوز ہوا۔ میں نے عرض کیا۔ مولانا فرض کیجئے۔ یہ لڑکے بڑے نالائق ہیں آپ شوق سے دوسرا کلاس بھی لے لیجئے لیکن ایک بات مجھے سمجھا دیجئے۔ آخر ہم آپ چھوٹوں ہی کی نالائقی پر کیوں برہم ہوتے ہیں اور بڑوں کی نالائقی انگیز کرتے ہیں۔ مولانا دھیمنے پڑ گئے اور کسی قدر مدہم سروں میں اتنا شد۔ پڑھ کر جلد ہی دوسری باتوں میں لگ گئے۔

مولانا کو چائے سے عشق تھا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر

کھانے کا بہانہ تھا۔ نصف پیالی شکر اور نصف چائے۔ اسی شجر  
 آدمیوں کے بھی بڑے شائق تھے۔ برسات میں پھنسیوں سے لہجائے  
 تھے۔ لیکن آم اور شکر کا ترک کرنا تو درکنار کم کرنا بھی گوارا نہ کرتے  
 تھے۔ ذیابیطس کے پُرانے مریض تھے۔ لیکن اس کی بالکل پروا  
 نہ کرتے تھے۔ اس وضع داری نے کارنجل سے دو چار کیا اور کارنجل  
 انھیں ان کے پیدا کرنے والے سے جا ملایا۔

مرحوم مقررہ میعاد عمر ختم کر کے ملازمت سے سبک دوش ہوئے  
 تھے لیکن اس سن و سال کے باوجود وہ اتنا کام کر لیا کرتے تھے  
 جو اُن سے بہت کم عمر والوں کے لیے مشکل تھا۔ اُن کے قوائے ذہنی و  
 جسمانی پورے طور پر استوار و بیدار تھے۔ شگفتگی و زندہ دلی کا دامن  
 کہیں سے چھوٹنے نہ پایا تھا۔ رندوں میں رند، پارسوں میں پارسا،  
 خردوں میں خرد، بزرگوں میں بزرگ، کیسے کیسے زمانے کیسی  
 کیسی محفلیں اور صحبتیں دیکھے اور برتے ہوئے۔ یہ ہمہ جہت شخصیت  
 بالآخر ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء کو جمعہ کے دن آغوش رحمت میں پہنچ گئی۔  
 اگست ۱۹۴۷ء کا غالباً پہلا ہفتہ تھا، مکان سے یونیورسٹی آ رہا تھا  
 کہ خبر ملی مولانا احسن کارنجل کی اذیت میں مبتلا ہیں۔ مولانا کی  
 اقامت گاہ پر پہنچا تو شدید کرب میں مبتلا پایا۔ مرحوم دیکھتے ہی

بہنہں کر بیٹھ گئے۔ ابھی پورے طور پر سلام و پیام بھی نہیں ہوا تھا کہ بے اختیار ہنسنے لگے اور کہیں حضور سنتا ہوں خنداں شائع ہو گئی۔ میرا نسخہ کہاں ہے۔ ہر ایک سے پوچھتا ہوں کوئی نشان نہیں دیتا۔ خدا را تھوڑی دیر کے لیے اپنا ہی نسخہ بھیج دیجئے۔ پڑھ کر واپس کر دوں گا۔

کہاں مرض الموت کا یہ کرب کہاں ایک معمولی سی کتاب کی طلب اللہ اکبر! میں مہوت ہو گیا اور ایک لمحہ کے لیے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان وزمین کی ساری پہنائیوں پر مریض کی شخصیت مستولی ہو گئی ہے۔ میں تھوڑی دیر تک دم بخود رہا لیکن مرحوم پھوڑے کی مسلسل ٹپس سے زرا نجات پاتے تو یہی کتنے رشید صاحب خدا را کتاب بھیج دیجئے۔ میں آدمی ساتھ کر دیتا ہوں وہ لائے گا۔ دل کی گان لے کہتے ہیں! عجب اتفاق کہ کتاب نہ میں بھیج سکا اور نہ مولانا کو مل سکی۔

L No. { 92.5.52  
 ACC NO. 12152  
 HOR 12/1/52  
 E 12/1/52

92.5.52 12152  
 12/1/52  
 12/1/52  
 12/1/52  
 BOOK ID AT THE TIME

Date	No.	Date	No.



## MAULANA AZAD LIBRARY ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

### RULES:—

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of **Re. 1.00** per volume per day shall be charged for text-books and **10 Paise** per volume per day for general books kept over-due.

